شرحِ دیوانِ غالب

27.4b

مولانا حسرت موہانی

غمِ ہستی کا، اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

Ubaid

ا
ک
ک
ر
م
ج
ج
ز
ص
تج
گ
دیا
جز
اجڑ
سیا
خوا
پیا
سبز
مجھ
ابھی
بادل
تمہ
دھو
اشکوا
آتش
بابل

بسم الله الرحمن الرحيم

شرحِ دیوانِ غالب

ملنے کے پتے

مکتبہ رحمانیہ، اقرا سنٹر، اردو بازار لاہور
سعد پبلیکیشنز، فرسٹ فلور میاں مارکیٹ اردو بازار، لاہور
کوالٹی ڈیپارٹمنٹل سٹور، کالج روڈ، بورے والا
کشمیر بک ڈپو، تلہ گنگ روڈ، چکوال
بنگش بک ڈپو اردو بازار، سیالکوٹ
مسلم بک لینڈ، بینک روڈ، مظفر آباد
مکتبہ رشیدیہ، نیو جنرل، چکوال
ضیاء القرآن پبلشرز، اردو بازار، کراچی
ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی
وہاڑی کتاب گھر- مین بازار، وہاڑی
یونیورسٹی بک ایجنسی، خیبر بازار، پشاور
رحمان بک ہاؤس، اردو بازار، کراچی
بک سنٹر علامہ اقبال چوک، سیالکوٹ
الکریم نیوز ایجنسی گول چوک، اوکاڑہ
منیر برادرز، مین بازار، جہلم
شائلہ لائبریری، محلہ چوہدری پارک، ٹوبہ ٹیک سنگھ
احمد بک کارپوریشن، اقبال روڈ، راولپنڈی
اقبال بک سٹال، ریل بازار، بورے والا

اسلامی کتب خانہ، فضل الٰہی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
مکتبہ العلم، ١٧- اردو بازار لاہور
چوہدری بک ڈپو، مین بازار، دینہ
میاں ندیم، مین بازار، جہلم
اسلامک بک سنٹر، اردو بازار، کراچی
دارالادب، تلمبہ روڈ، میاں چنوں
ضیاء القرآن پبلشرز، گنج بخش روڈ، لاہور
اشرف بک ایجنسی، کمیٹی چوک، راولپنڈی
فرید پبلشرز، نزد مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی
شمع بک ایجنسی، فیصل آباد
کتاب گھر، علامہ اقبال روڈ، راولپنڈی
ہاشمی برادرز، مشن چوک، کوئٹہ
نیو الیاس کتاب محل کچہری بازار، جڑانوالہ
ڈائمنڈ بک ڈپو، بینک روڈ، مظفر آباد آزاد کشمیر
بختیار سنز، قصہ خوانی بازار، پشاور
ادریس کتاب محل، مین بازار، منڈی سمبڑیال
الاخوان القادری منڈی کارنر اندرون بوہڑ گیٹ ملتان

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ خزینہ علم و ادب / مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جا سکتا اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کاروائی کا حق محفوظ ہے۔

شرحِ دیوانِ غالب

حسرت موہانی

خزینہ علم و ادب
الکریم مارکیٹ اردو بازار - لاہور ۷۳۱۴۱۶۹

دیدہ زیب اور
خوبصورت کتب کا
واحد مرکز

تزئین و اہتمام
نذیر محمد طاہر نذیر،

84247

جملہ حقوق محفوظ ہیں

اشاعت ۲۰۰۲ء
سرورق عبیداللہ
اہتمام محمد نذیر، طاہر نذیر
کمپوزنگ الاشراق کمپوزنگ سنٹر، لاہور
مطبع زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور
قیمت 150/- روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ردیف الف

◆

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

نقش معنی تصویر۔ تصویر چونکہ کاغذ پر ہوتی ہے اس لیے اسے فریادی کہا کیونکہ ولایت میں فریادی کاغذی پیرہن پہن کر عدالت میں جاتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ہستی چونکہ موجب ملال و آزار ہے اس لیے تصویر بھی اپنے صانع کی بزبان حال شکایت کرتی ہے کہ مجھ کو ہست کر کے کیوں مبتلائے رنج ہستی کیا۔ (ماخوذ از عود ہندی) مقصود شاعر یہ ہے کہ ہستی بہر حال (یعنی اگرچہ مثل ہستی تصاویر اعتبار محض ہو) موجب آزار ہے۔

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

یعنی شب ہائے ہجر کا کاٹنا ویسا ہی سخت ہے جیسا کہ فرہاد کے لیے جوئے شیر لانا تھا۔ صبح کی سپیدی اور جوئیف شیری میں جو مشابہت ہے وہ ظاہر ہے۔ کاوکاو سے کاوش و کاہش مراد ہے۔

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

یعنی عاشق کے شوق شہادت کی کشش کا یہ اثر ہے کہ دم شمشیر سینۂ شمشیر سے باہر نکلا پڑتا ہے۔

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

یعنی ہماری تقریر ایسی ہے کہ اس کے مفہوم سے (باوجودِ کوششِ بسیار) کوئی آگہی حاصل نہیں کر سکتا۔ دامِ شنیدن بچھائے یعنی سن کر سمجھنا چاہے۔

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

آتش زیر پا' محاورہ فارسی میں بے قرار کو کہتے ہیں۔ موئے آتش دیدہ یعنی بال جو آگ کو دیکھ کر حلقہ دار اور کمزور ہو گیا ہو اور اس میں حلقۂ زنجیر کی مشابہت پیدا ہو گئی ہو۔

مطلب یہ ہے کہ میرے جنون بے قرار کے مقابلے میں حلقہ ہائے زنجیر کی مضبوطی کی کچھ ہستی نہیں ہے۔ آتش زیر پا کی رعایت سے غالب نے حلقۂ زنجیر کو موئے آتش دیدہ کہا ہے۔

شمارِ سُبحہ مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

تسبیح میں چونکہ سو دانے ہوتے ہیں۔ اس لیے ظاہر ہے کہ شمار سبحہ سے "بیک کف بردنِ صد دل" کی پھبتی کسی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کو شمار سبحہ اس وجہ سے پسند ہے کہ اس میں حسب خواہش و عادت محبوب کے ایک ہی وار میں سو سو دل لے لینے کی مشابہت پائی جاتی ہے

بہ فیضِ بے دلی نومیدیِ جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

کشائش نے اپنا عمل کرنے کے لیے ہمارے عقدہ مشکل و نومیدی جاوید کو پسند کیا اور ہماری مشکل آسان ہو گئی۔ اس طور یہ کہ ہم کو دنیا کی جانب سے جو بے دلی پیدا ہو گئی ہے اس کے سبب سے صدمہ نومیدی جاوید کا برداشت کرنا آسان ہو گیا ہے کیونکہ غایت بے دلی کی حالت میں امید و ناامیدی یکساں ہو جاتی ہیں۔

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

مطلب یہ ہے کہ خواہش سیر گل سے اس بے درد کی بے مہری ظاہر ہوتی ہے کیونکہ اس جفا پسند کو تماشائے گل صرف اس وجہ سے پسند ہے کہ گل اپنی سرخی کی بنا پر ''بسمل بخوں غلطیدہ'' سے مشابہ ہوتا ہے۔

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ
مبارک باد اسد غم خوارِ جانِ دردمند آیا

غمخوار جان دردمند یعنی عشق آیا ہے اور جراحت و الماس داغ جگر بطور ہدیہ ہمراہ لایا ہے۔ ایسے ہدیوں پر مبارکباد دے کر اپنی ایذا دوستی کا اظہار کیا ہے۔ الماس کے کھا لینے سے دل و جگر زخمی ہو جاتے ہیں۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

چشم حاسد کی تنگی مشہور ہے۔ پس کہتا ہے کہ شاید صحرا بھی چشم حاسد کے مانند تنگ تھا کہ مجنوں کے سوا صحرا نوردی کا پھر کوئی مرد میدان نہ نکلا۔

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

سویدا کو داغ سے اور آشفتگی کو دود سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ مقصود شاعر یہ ہے کہ جس طرح دھوئیں سے داغ پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح آشفتہ خاطری اور پریشانی کے دود سے دل میں داغ سویدا کی صورت قائم ہوتی ہے۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

یعنی ہنوز مبتدی ہوں جس طرح لڑکے پہلے آمد نامہ پڑھتے ہیں کہ رفت کے معنی "گیا" اور بود کے معنی "تھا" وغیرہ۔ لطف یہ ہے کہ رفت و بود دونوں ماضی کے صیغے ہیں جس سے مطلب یہ ہے کہ دل اب عیش و فراغت سے بالکل محروم ہے۔

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا
تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

○

کہتے ہو نہ دیں گے دل ہم نے گر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

ہم نے مدعا پایا یعنی ہم آپ کا مطلب سمجھ گئے کہ آپ نے ہمارا دل پا لیا ہے اور یہ باتیں کہ "اگر ہم تیرا دل پائیں گے تو نہ دیں گے" - دل پا لینے کے بعد کی ہیں یعنی جیسے لوگ کوئی گم شدہ چیز پا کر چھیڑنے کے لیے مالک شے سے کہا کرتے ہیں۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

عشق ایک درد لادوا ہے لیکن وہی عشق دردِ زیست کی دوا بھی ہے کیونکہ اسی سے طبیعت نے زندگی کا مزا پایا ورنہ بغیر عشق کے زندگی گویا ایک درد تھی۔

دوستدار دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

ہمارا دل دشمن کا دوست ہے اس لیے کہ اس نے جو آہ کی تو بے اثر' اور نالہ کیا تو نارسا- پس اس کا کیا اعتبار ہے- یہاں شاید دشمن سے دشمن عشاق یا دشمن وفا غرضیکہ محبوب مراد ہے-

سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

اہل حسن کی سادگی اور بے پروائی سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنے مشتاقوں کی جرات کو ازمائیں یعنی یہ دیکھیں کہ ان کو سادہ سمجھ کر ارباب اشتیاق جرات گستاخی تو نہیں کرتے- اس سے ظاہر ہے کہ اس قسم کی سادگی کو در حقیقت پرکاری اور بے خودی کو ہوشیاری سمجھنا چاہیے-

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

یعنی غنچہ کو دیکھ کر ہم کو اپنا دل گم گشتہ و خوں شدہ یاد آیا کہ اس کی بھی یہی ہیئت تھی-

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈا تم نے بارہا پایا

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

آپ سے یعنی ناصح سے- آپ کا لفظ بہ طور طنز استعمال کیا گیا ہے-

○

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا

دل میں' ذوقِ وصل و یادِ یار تک' باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ' جو تھا جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں، ورنہ غافل! بارہا
میری آہِ آتشیں سے، بالِ عنقا جل گیا

اپنی نیستی کا حال بہ مبالغہ بیان کرتا ہے کہ پہلے جب میں فنا کے عالم میں تھا تو بارہا میری آہ آتشیں سے بازوے عنقا جل گیا کہ وہ بھی عدم میں تھا لیکن اب تو میں اس درجہ سے بھی پرے ہوں۔

عرض کیجے، جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں!
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ، صحرا جل گیا

عرض کیجے یعنی پیش کیجے۔ جوہر اندیشہ کی گرمی کا بیان یہ ہے کہ وحشت کا صرف خیال آیا تھا کہ اس کے اثر سے صحرا جلا گیا۔ یعنی چونکہ وحشت کی حالت میں صحرا نوردی کی نوبت ضرور آتی ہے اس لئے خیال وحشت سے صحرا جلنے لگا۔

دل نہیں، تجھ کو دکھاتا ورنہ، داغوں کی بہار
اس چراغاں کا، کروں کیا، کارفرما جل گیا

کارفرما یعنی حکم فرما۔ ہر کام کے لئے ایک کام لینے والا (کارفرما) اور بہت سے کام کرنے والے کارکن ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو اس چراغاں یا داغوں کی بہار کا کارفرما تھا وہی نہ رہا ورنہ تجھ کو اس چراغاں کی کیفیت دکھاتا۔

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو، غالب! کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

○

شوق، ہر رنگ، رقیبِ سروساماں نکلا
قیس، تصویر کے پردے میں بھی، عریاں نکلا

شوق بہ معنی عشق۔ رقیب بہ معنی دشمن مطلب یہ ہے کہ عشق سروسامان کا دشمن ہے دیکھو کہ

مجنوں تصویر میں بھی عریاں رہتا ہے۔ بقول غالب قیس کی تصویر بھی عریاں ہی کھینچی جاتی ہے۔

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی' یارب!
تیر بھی سینۂ بسمل سے پَرافشاں نکلا

"زخم نے داد نہ دی تنگی دل کی" یعنی تنگی دل کو زائل نہ کیا۔
مطلب یہ ہے کہ تیر خود ضیق مقام سے گھبرا کر پرافشاں اور سراسیمہ نکل گیا وہ تنگیٔ دل کی داد کیا دیتا۔ (عود ہندی) اس شعر میں زخم تیر کی توہین بہ سبب ایک رخنہ ہونے کے کی ہے۔ مثلاً ایک دوسرے شعر میں بھی زخم تیغ کو جراحت پیکاں پر فوقیت دی ہے لکھتا ہے۔

نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے
بوئے گل' نالۂ دل' دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا' سو پریشاں نکلا
دلِ حسرت زدہ' تھا مائدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا' بقدرِ لب و دنداں نکلا

یعنی میرے یاران ہمنشیں میں سے ہر ایک میری حسرت دل سے بقدر استعداد متاثر ہوا۔

ہے نو آموزِ وفا' ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

درس فنا نہایت مشکل سمجھا جاتا ہے لیکن اے ہمت دشوار پسند یہ تو بڑی مشکل ہوئی کہ نو آموزی ہی کی حالت میں اس کی آسانی تجھ پر کھل گئی اور اب تیرے طے کرنے کے لئے اس سے بھی زیادہ دشوار مرحلہ درکار رہا۔

مطلب یہ ہے کہ میری ہمت دشوار پسند کے لئے فنا سے بالاتر کوئی مرتبہ چاہیے کیونکہ فنا اسے ایک آسان مرحلہ ثابت ہوا۔

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالبؔ!
آہ! جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفاں نکلا

○

دھمکی میں مر گیا، جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ، طلب گارِ مرد تھا

باب نبرد یعنی لائق نبرد۔ مرد میدان عشق

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

یعنی ابتدا ہی سے میں بندہ عشق و وفا ہوں جبکہ خیالات میں پختگی اور جمعیت بھی نہیں آئی تھی۔

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

اس رہگزر میں (یعنی دل سے جگر تک) کسی زمانہ میں شادابی کا یہ عالم تھا کہ جلوۂ گل اس کے آگے گرد تھا یا اب یہ کیفیت ہے کہ وہی رہگذر دریائے خوں کا ساحل بنا ہوا ہے۔

جاتی ہے کوئی کش مکش اندوہِ عشق کی!
دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا

یعنی دل کے جانے کے بعد بھی اندوہ عشق کی کشمکش نہ گئی کیونکہ اس حالت میں دل کے جانے کا افسوس رہا بقول میر تقی۔

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دم کے جانے کا نہایت غم رہا

احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال، بیاباں نورد تھا

یہ لاش بے کفن، اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا

○

دہر میں، نقشِ وفا، وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ، شرمندۂ معنی نہ ہوا

لفظ وفا کا مفہوم حقیقی مفقود ہو گیا ہے۔ مثلاً آج کل نئے ریفارمروں کی تقریروں میں الفاظ ''قوم'' قومی کا مفہوم۔ پس جب معنی معدوم ہیں تو صرف نقش یعنی لفظ وفا سے کیونکر تسلی ہو سکتی ہے۔

سبزۂ خط سے، ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زُمرّد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

کہتے ہیں عکس زمرد سے سانپ اندھا ہو کر مغلوب ہو جاتا ہے لیکن یہاں الٹا معاملہ ہے کہ مرد (سبزہ خط) افعی (کاکل) کا حریف نہیں ہو سکتا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دل گزر گاہِ خیال مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہوا

سرمنزل یعنی منزل۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تقویٰ ممکن نہیں ہے تو رندی ہی سہی۔

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا

میں اس میں راضی ہوں کہ تو نے وعدہ نہ کیا کیونکہ اگر تو وعدہ لطف کرتا تو میرے کان ان الفاظ تسلی کے احسان مند ہوتے حالانکہ مجھ کو یہ پسند نہیں ہے۔ اسی قسم کے مضمون کا دوسرا شعر بھی ہے۔

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں، سو وہ بھی نہ ہوا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

دم عیسوی کا اعجاز مشہور ہے کہ اس سے مردے زندہ اور بیمار شفایاب ہو جاتے تھے لیکن شاعر کہتا ہے کہ میرے معاملہ میں ابھی حضرت عیسیٰ کے منہ سے کوئی لفظ بھی نہ نکلا تھا اور لبوں کو جنبش ہی ہوئی تھی کہ میں اس جنبش لب کے صدمے سے مر گیا اور مجھ کو دم عیسیٰ سے سابقہ نہ پڑا۔

◆

ستائش گر ہے زاہد اس قدر، جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

کہتا ہے کہ ہم بے خودی کے ایسے خوش گوار عالم میں رہتے ہیں جس کے مقابلے میں ہم نے جنت کو فراموش کر دیا ہے۔

بیاں کیا کیجیے بیداد کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر یک قطرۂ خوں، دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

جس طرح تسبیح کے دانوں میں سوراخ ہوتا ہے اسی طرح مژگان یار کی کاوش سے میرے

لئے ہر قطرہ خون کی یہ کیفیت ہوگئی ہے۔

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع، میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا، ہوا ریشہ نیستاں کا

میں نے دانتوں میں تنکا اظہار عجز کے لئے لیا تھا لیکن وہ ریشہ نیستاں ہوں گیا یعنی قاتل کا رعب داب میرے نالوں کو روک نہ سکا۔ ۱۲ تنکے کو ریشہ نیستاں اس لئے کہا کہ نے سے آواز مانند نالہ پیدا ہوتی ہے۔

دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل، اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

کیا آینہ خانے کا وہ نقشہ، تیرے جلوہ نے
کرے جو پرتوِ خورشید، عالم شبنمستاں کا

مری تعمیر میں مضمر، ہے اک صورت خرابی کی
ہیولٰی برقِ خرمن کا، ہے خونِ گرم دہقاں کا

ہیولٰی یعنی مادہ۔ خون گرم مجازاً بمعنی سعی وکوشش۔ دہقاں کے خون کی گرمی جو فراہمی خرمن کی سعی و مشقت سے پیدا ہوتی ہے وہی گویا اس کے خرمن کے لئے برق ہو جاتی ہے اس لئے کہ نہ وہ خرمن اکٹھا کرتا نہ اس کی بربادی کی صورت پیدا ہوتی۔

مصرعہ ثانی مصرعہ اول کی مثال ہے۔ اس شعر میں ایک فلسفیانہ مسئلہ شاعرانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے یعنی ہر شے کا وجود ہی اس کے فنا پر دلالت کرتا ہے۔

اُگا ہے گھر میں ہر سُو سبزہ، ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے، ہے میرے درباں کا

خموشی میں نہاں، خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں، میں بے زباں، گورِ غریباں کا

ہنوز، اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ، گویا، حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

خیال یار کو یوسف اور دل افسردہ کو حجرہ زنداں یوسف قرار دیا ہے۔

بغل میں غیر کی، آج آپ سوتے ہیں کہیں، ورنہ
سبب کیا، خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا؟

نہیں معلوم، کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا!
قیامت ہے، سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

معلوم نہیں کہ تیری جفا سے کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا جس کی ندامت کے باعث سے تیری آنکھیں سرشک آلود ہیں۔ یا یہ کہ نہیں معلوم تیرے رونے نے کس کس کو رلایا ہو گا۔

نظر میں ہے ہماری، جادۂ راہِ فنا، غالب!
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

یعنی راہ فنا ہر وقت ہمارے پیش نظر رہتی ہے۔

جادۂ راہ فنا کو دنیا کے اجزائے پریشاں کا شیرازہ اس لئے کہا ہے کہ جملہ موجودات عالم فنا ہونے کے معاملہ میں ایک ہی روش رکھتے ہیں کیونکہ سب کے لئے فنا ہونا یقینی ہے۔

○

نہ ہو گا، یک بیاباں ماندگی سے، ذوقِ کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

یک بیاباں ماندگی یعنی کثرت ماندگی۔ ذوق۔ یعنی ذوق رہ نوردی۔ نقش قدم کو حباب اور رفتار کو موجہ قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح حباب موج کے ساتھ ہی ساتھ چلتا ہے اور کبھی ماندہ نہیں ہوتا اسی طرح میرا ذوق صحرانوردی بھی کسی طرح کم نہ ہو گا۔

محبت تھی چمن سے، لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے، ناک میں آتا ہے دم میرا

◆

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

افسوس حاصل کا، یعنی اپنی ہستی کا۔ برق یعنی برق عشق۔ مطلب یہ ہے کہ میں طاعت گزار ہوں برق عشق کا اور طالب ہوں فنا کا لیکن ساتھ ہی اس کے چونکہ الفت ہستی فطرت انسانی میں داخل ہے اس لئے جادہ بھی عزیز ہے۔ پس میں حاصل یعنی ہستی کا افسوس کرتا ہوں جس سے میرے کمال شوق فنا میں کسی قدر نقص بھی نمودار ہے مختصر یہ کہ میں موت کا طلبگار ہوں اور اپنی ایسی زندگی پر افسوس کرتا ہوں جس پر موت کو ترجیح ہے۔

بقدر ظرف ہے، ساقی! خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے، تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

ساقی کو دریائے شراب اور خود کو اس کے ساحل کا خمیازہ قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر شراب پلانے میں ساقی کی ہمت بڑھی ہوئی ہے تو مجھ میں بھی اسی کی نسبت سے دریا نوشی کی قوت موجود ہے۔

◆

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

یاں۔ یعنی دنیا میں۔ حجاب یعنی پردہ۔ جس کو پردہ ساز کے ساتھ مناسبت لفظی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ راز کے نغموں سے تو خود ہی ناآشنا ہے ورنہ دنیا میں جو بظاہر حجاب نظر آتے ہیں وہ بھی پردہ ساز کی طرح بول رہے ہیں اور بج رہے ہیں اور اسرار الٰہی ظاہر کر رہے ہیں (یادگار غالب)

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

شب وصل کی صبح کو محبوب کا رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے یعنی اس کی دلپذیری قابل دید ہے اس لئے کہ گل ہائے ناز کے شگفتہ ہونے یعنی اس کے سرگرم ناز ہونے کا یہی خاص وقت ہے۔

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا، وگرنہ میں
طعمہ ہوں، ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

صرفہ یعنی فائدہ۔ ضبط آہ میں میرا فائدہ ہے کیونکہ بہ حالت دیگر ایک ہی نفس جاں گداز مجھے فنا کر دیتا۔

ہیں، بسکہ جوشِ بادہ سے، شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط، ہے سرِ شیشہ باز کا

شیشہ بازی رقاصی کا ایک فن ہے جس میں رقاص پانی اور گلاب کی صراحیاں اور شیشے سر پر لے کر رقص کرتے ہیں لیکن شیشے گرنے نہیں پاتے۔ یہاں شیشوں کے اچھلنے کے سبب سے بزم عیش کے گوشہ فرش کو شیشہ باز کا سر کہا ہے۔

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ، ہے ہنوز
ناخن پہ قرض، اس گرہِ نیم باز کا

یعنی ناخن نے میرے گرفتہ دل کو جیسا چاہئے تھا ویسا نہیں چھیڑا تھا اور گویا اس پر دل کا قرض باقی رہ گیا تھا۔ پس اب دل ناخن غم سے اسی قرض کاوش کا تقاضہ کر رہا ہے۔

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا، اسدؔ!
سینہ کہ، تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

○

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیوُ یارب! یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

بہادر شاہ ظفر کے مذاقِ سخن اور مجمع شعرا کے لحاظ سے بزمِ شاہنشاہ کو گنجینہ گوہر کہا۔

شب ہوئی، پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے، کہ گویا بت کدہ کا در کھلا

بتکدے میں چراغ روشن ہوتے ہیں۔ ستاروں کو چراغ سے مشابہت دی یا یہ کہ ستارے خود بتوں سے مشابہ ہیں۔

گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا

یعنی ظاہر میں تو دوست کے ہاتھ میں فصد کے لئے نشتر موجود ہے جس سے ثابت ہو کہ اسے علاج دیوانگی منظور ہے مگر آستیں میں مجھے قتل کرنے کے لئے خنجر پوشیدہ ہے۔

گو نہ سمجھوں اس کی باتیں، گو نہ پاؤں اس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ، مجھ سے وہ پری پیکر کھلا
ہے، خیالِ حسن میں، حسنِ عمل کا سا خیال
خُلد کا اک در، ہے میری گور کے اندر کھلا

کہتے ہیں کہ اعمال نیک کی بدولت قبر میں درواہ جنت کھل جاتا ہے۔ یہاں غالبؔ خیال حسن کو حسن عمل سے مشابہ قرار دیتا ہے کیونکہ تصور حسن یار سے بھی گوشۂ لحد نمونہ خلد بن گیا ہے۔

منہ نہ کھلنے پر، ہے وہ عالم کہ، دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر، نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

کیوں اندھیری ہے شبِ غم؟ ہے بلاؤں کا نزول!
آج ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

’’کیوں اندھری ہے شب غم‘‘ اس کا جواب یہ ہے کہ آج بلاؤں کا نزول ہے جن کے اترنے کا تماشا دیکھنے کی غرض سے تاروں کا رخ زمین سے آسمان کی جانب پھر گیا ہے۔

کیا رہوں غربت میں خوش؟ جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

قاعدہ ہے کہ اخبار مرگ وحوادث کے متعلق خطوط اکثر کھلے ہوئے ہی روانہ کیے جاتے ہیں۔

اسکی امت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند؟
واسطے جس شہ کے، غالب! گنبدِ بے در کھلا

گنبدِ بے در کھلا یعنی شبِ معراج میں، گنبدِ بے در یعنی آسمان

○

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا

یعنی میرے سوز دل کے خیال سے ابر کا پتا پانی ہوا جاتا تھا۔ اور اس کی تاثیر سے پانی میں جو گرداب پڑتے تھے وہ شعلہ ہائے جوالہ معلوم ہوتے تھے۔

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام
گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ وہ عذر بارش کی بناء پر یہاں تک نہ آئے اور میں اس قدر رویا کہ تکیے

کی روئی آنسوؤں سے تر ہو کر ہجوم اشک میں کف سیلاب کے مانند ہو گئی۔

واں، خود آرائی کو، تھا موتی پرونے کا خیال
یاں، ہجومِ اشک میں، تارِ نگہ نایاب تھا
جلوۂ گل نے کیا تھا واں، چراغاں آب جُو
یاں، رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا
یاں، سرِ پُرشورِ بے خوابی سے تھا دیوار جو
واں، وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کم خواب تھا

دیوار جو تھا یعنی سر ٹکرانے کے لئے دیوار تلاش کرتا تھا۔ اس پورے قطعے میں اپنی محرومی اور محبوب کی بے پروائی کا حال مختلف پیرایوں میں مقابلہ کر کے دکھایا ہے۔

یاں، نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بے خودی
جلوۂ گل واں، بساطِ صحبتِ احباب تھا
فرش سے تا عرش واں، طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا
ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا
دل، کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا یعنی اس طور پر غزل سرا ہوا۔ یہ اس غزل کے دوسرے شعر کی طرف اشارہ ہے۔

نالہ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا

نایاب تھا یعنی نہ تھا۔ دوسرے مصرعہ میں نایابی اثر کی تشریح کرتا ہے کہ دل بیتاب تھا مگر کیا تھا

گویا غیر کی بزم وصل کا سپند تھا۔ یعنی اس کی بیتابی میرے خلاف تھی۔

مقدمِ سیلاب سے کیا دل نشاط آہنگ

ہے

خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب

تھا

مقدم بہ معنی آنا۔ نشاط آہنگ یعنی مسرور، ساز صدائے آب مثلاً جلترنگ۔ مطلب یہ ہے کہ عشاق کو اپنی بربادی اس قدر مرغوب ہوتی ہے کہ اپنے مکان میں سیلاب کے آنے سے وہ اس درجہ مسرور ہیں کہ گویا جلترنگ سن رہے ہیں۔

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں

پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

اندیشہ بہ معنی خیال۔ خاک نشینی کے زمانے کی کیفیتیں نہ پوچھ کہ ہم خاک نشینی کو بستر سنجاب سمجھا کرتے تھے اور زمین پر ہم کو بستر سنجاب کی سی راحت ملتی تھی۔

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں

ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

جنون نارسا عشق ناتمام۔ روکش مقابل یعنی اگر عشق ناتمام نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ ذرہ آفتاب کے برابر ہو جاتا لیکن نارسائی جنون نے اکتساب فیض سے محروم رکھا اور ایسا نہ ہونے پایا۔

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا

انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے!

اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

○

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب

84247

خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

یعنی آنکھوں سے اس قدر خون جاری رہتا ہے گویا جگر میں جتنا خون تھا وہ مژگان یار کی امانت تھا۔ اور اس لئے اس کے ایک ایک قطرے کا حساب اسی طرح دینا پڑے گا جس طرح امانت کا حساب دینا پڑتا ہے (یادگار غالب)

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینۂ تمثال دار تھا

آئینے سے یہاں دل اور یک شہر آرزو سے ہجوم تمنا مراد ہے یعنی تو نے دل شکنی کر کے ہزاروں آرزوؤں کا خون کر ڈالا۔

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا

دشت وفا کی سراب کا ذرہ ذرہ تیغ آبدار کے جوہر سے مشابہ ہے۔ یعنی اہل وفا کے قتل کا سامان رکھتا ہے۔ فریب وفا کے لحاظ سے استعارہ سراب موزوں ہے۔

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو، پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

○

بسکہ دشوار ہے، ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں، انساں ہونا

انسان ہونا یعنی حقیقی صفات وسیرت انسانی کا پیدا کرنا۔

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا
جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

یعنی حسن یار کا تقاضا ہے کہ مجھے دیکھو اس لئے آئینہ آنکھ اور جوہر پلکیں بنجانا چاہتے ہیں۔

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظّارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

اہل تمنا تیری تلوار کو عریاں دیکھ کر شوق شہادت میں ویسے ہی خوش ہوتے ہیں جیسے لوگ عید کا چاند دیکھ کر ہوا کرتے ہیں۔

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا

بصد رنگ گلستاں ہونا یعنی فرط مسرت سے باغ باغ ہونا۔ یعنی اب تم خوش ہو ہم دنیا سے ناکام و نامراد گزر گئے۔ یہ طعن و طنز کی گفتگو ہے۔

عشرتِ پارۂ دل، زخمِ تمنا کھانا
لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

اپنی ایذا دوستی کا اظہار کیا ہے۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے! اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
حیف! اس چار گرہ کپڑے کی قسمت، غالب!
جس کی قسمت میں ہو، عاشق کا گریباں ہونا

یہ شعر نہایت خوب ہے لیکن دونوں مصرعوں میں قسمت کی تکرار نے کسی قدر بے لطفی پیدا کردی ہے

○

شب، خمارِ شوقِ ساقی، رستخیز اندازہ تھا
تامحیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

شوق ساقی۔ ساقی کی آمد کا شوق جو بادہ کشوں کے دل میں تھا رستخیز اندازہ یعنی قیامت کے مانند محیط بادہ خط ساغر جہاں تک شراب ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ شوق ساقی کے خمار میں کچھ اس قیامت کا جوش تھا کہ میخانے کی ہر شے یہاں تک کہ شراب بھی خمیازہ کش ہو رہی تھی اور اس طرح پر ایک صورت خانہ خمیازہ کی کیفیت پیش نظر ہو گئی تھی۔ غرض کہ مضمون یہ ہے کہ ساقی کی آمد کی ہر شے مشتاق و منتظر تھی۔

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہ اجزا اے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

یک قدم وحشت یعنی اندک وحشت، دو عالم دشت سے کثرت مراد ہے جادہ یعنی جادۂ وحشت کو اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ اس بناء پر کہا کہ یک قدم وحشت سے یعنی ذرا ہی سی وحشت سے تمام دفتر امکان کی حقیقت معلوم ہو گئی۔ مطلب یہ ہے کہ دفتر امکان کا درس، بہ صحت عقل و ہوش بر بنائے خوف و کم ہمتی مشکل تھا وحشت نے اسے آسان کر دیا کیونکہ بیباکی وحشت و دیوانگی نے اس پست ہمتی کو مٹا دیا۔

مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ، کون ہے؟
خانۂ مجنونِ صحرا گرد، بے دروازہ تھا

مجنون صحرا گرد کے گھر (یعنی صحرا) میں دروازہ بھی نہ تھا جو بند ہوتا اور لیلیٰ اندر نہ جا سکتی پھر معلوم نہیں کیا سبب مانع ہے کہ وہ بھی بہ تقاضائے وحشت وہاں تک نہیں پہنچ پاتی۔

پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن
دست مرہون حنا، رخسار رہن غازہ تھا

استغنائے حسن کی شان یہ تھی کہ اسے کسی دوسری چیز کی ضرورت نہ ہوتی۔ پس یہ حنا اور غازے کا استعمال انداز استغنا کی رسوائی کا موجب ہے۔

نالۂ دل نے دئیے اوراقِ لختِ دل بہ باد
یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

دل گویا ایک دیوان تھا اور لختہائے دل اس دیوان کے ورق تھے۔ نالۂ دل نے ان اوراق کو پریشان کر دیا اور دل نے ایک دیوان بے شیرازہ کی شکل اختیار کر لی۔

○

دوست، غمخواری میں میری، سعی فرمائیں گے کیا؟
زخم کے بھرتے تلک، ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا؟
بے نیازی حد سے گزری، بندہ پرور! کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل، اور آپ فرمائیں گے 'کیا؟'
حضرتِ ناصح گر آویں، دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو، کہ سمجھائیں گے کیا؟
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا؟
گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا! یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا؟
خانہ زاد زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟
ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت، اسدؔ!
ہم نے یہ مانا، کہ دلی میں رہیں، کھائیں گے کیا؟

غمِ الفت جو میری غذا ہے وہ یہاں مفقود ہے۔ یعنی کوئی معشوق اب یہاں دل لگانے کے قابل نہیں رہا۔

○

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا

ترے وعدہ پر جیے ہم، تو یہ جان، جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا

جھوٹ جانا یعنی تیرے وعدے کو۔ اگر جھوٹ نہ جانتے تو شادی مرگ کی صورت پیدا ہوتی۔

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا

تیر نیم کش یعنی وہ تیر جس کے لئے کمان نہ کھینچی گئی ہو یعنی آہستہ سے لگایا گیا ہو۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا

شرار سنگ میں پنہاں ہوتا ہے۔ غالب کہتا ہے کہ اگر شرار سنگ شرار غم کے مانند ہوتا تو رگِ

سنگ سے بھی ایسا لہو ٹپکتا کہ پھر نہ بند ہوتا۔ یعنی پتھر پر بھی غم کا اس قدر اثر ہوتا۔

غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

دل کبھی غم سے خالی نہ رہ سکتا اس لئے غم عشق ہی غنیمت ہے کیونکہ اگر یہ نہ ہوتا تو دیگر افکار دنیا کا رنج لاحق ہوتا۔

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے! شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا؟

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی، تو کہیں دو چار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان، غالب!
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

○

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا!
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا؟

نشاط کے معنی امنگ کے ہیں۔ نشاط کار یعنی کام کرنے کی امنگ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں چہل پہل ہے، وہ صرف اس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ انسان کی ایک طبعی خصلت معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر فرصت قلیل ہوتی ہے اسی قدر زیادہ سرگرمی سے کام کو سر انجام کرتا ہے۔ (یادگار غالب)

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا؟
کہاں تک اے سراپا ناز 'کیا' کیا
نوازش ہائے 'بیجا' دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا؟

نوازشہائے بیجا یعنی اغیار پر شکایت ہائے رنگیں۔ نوازشہائے بیجا کی شکائتیں جو بہ لہجۂ محبت ادا کی جاتی ہیں نہ بطریق رنج وشکوہ۔

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا؟

تغافل تمکیں آزما۔ ایسا تغافل جس سے ارباب شوق کے صبر و استقلال کی آزمائش کیجائے۔ بے محابا یعنی بے تامل و بے تکلف۔

فروغِ شعلۂ خس' یک نفس ہے
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا؟

ہوس ضد عشق صادق۔ ہوس کو عشق کاذب اور ناپائیدا ہونے کی بناء پر شعلۂ خس سے تشبیہ دی ہے جس کی روشنی دم بھر سے زیادہ قائم نہیں رہ سکتی۔

نفس' موجِ محیطِ بے خودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا؟

ساقی عطائے شراب کے معاملے میں تغافل کرتا ہے تو ہم کو کیا شکایت ہوسکتی ہے ہم یوں ہی یعنی اس کی صورت دیکھ کر اس درجہ بیخود میں کہ ہماری ہر سانس گویا محیط بے خودی کی ایک موج ہے

دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہائے صبا' کیا؟

اگر آوارگی صبا کے سبب سے پیراہن یار کے عطر کی خوشبو پریشان ہو جاتی ہے تو ہمیں اس کا

کیا غم یعنی غم تو اس وقت ہوتا جب ہم کو اس کے سونگھنے کا دماغ ہوتا۔

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ اَنا البحر
ہم اس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا؟

ہر قطرے کے دل سے انا البحر کا نغمہ نکل رہا ہے دوسرے مصرعے میں اس بیان کو اپنی ذات پر منطبق کیا ہے اور اپنے کو ایک قطرہ قرار دے کر کہتا ہے کہ ہم بھی انا البحر (انا الحق) کے مقام میں ہیں کیونکہ ہم اس بحر بیکراں (ہستی نامحدود الٰہی) کے ایک جزو ہیں۔

محابا کیا ہے، میں ضامن، اِدھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا؟

عشاق کہ شہید نگاہ کرنے میں تجھے کیا تامل ہے اس کا یہ ضامن ہوں کہ تجھ سے کوئی خوں بہا کا طلبگار نہ ہوگا۔

سن، اے غارت گرِ جنسِ وفا! سن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا؟

شکست قیمت یعنی قیمت کا گھٹانا۔ اس سے ظاہر ہے کہ شکست کی کوئی صدا نہیں ہوتی۔ پس اے جنس وفا کے غارتگر اس کو نہ توڑ کیونکہ اس کی شکست سے سامعہ نوازی بھی تو نہیں ہوتی۔

کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ؟
شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا؟
یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں؟
یہ کافر فتنۂ طاقت رُبا کیا؟

''یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں'' یعنی اے قاتل یہ وعدۂ صبر کیوں ہے۔ اس میں صفت یہ ہے کہ ''قاتل'' کو وعدۂ صبر آزما کی صفت بھی قرار دے سکتے ہیں۔

بلائے جاں ہے، غالبؔ! اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا؟

○

درخورِ قہر و غضب، جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
روبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا

آئینہ میں چونکہ شبیہ نظر آتی ہے اس لئے آئینہ سیما کی صفت بت کے ساتھ اس موقع کے مناسب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی نے حسن میں تجھ سے مقابلہ نہ کیا۔

کم نہیں، نازشِ ہم نامیِ چشمِ خوباں
تیرا بیمار، برا کیا ہے، گر اچھا نہ ہوا

چشم خوباں کی بھی صفت ''بیمار'' ہے پس بیمار ہونے میں فخر ہمنامی کا حاصل ہونا ظاہر ہے۔

سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

سینے کا داغ ہے یعنی تنگ سینہ ہے۔ خاک کا رزق ہے۔ یعنی رایگاں ہے۔ اور حقیقت میں ہونا بھی یہی ہے کہ جو قطرہ دریا تک نہیں پہنچتا وہ جذب خاک ہو کر رایگاں ہو جاتا ہے اور جو نالہ لب تک نہیں پہنچتا اس کے ضبط کرنے سے سینے میں داغ پڑ جاتا ہے۔

نام کا میرے ہے وہ دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا
ہر بُنِ مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوناب
حمزہ کا قصہ ہوا، عشق کا چرچا نہ ہوا
قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

دیدہ بینا کچھ لڑکوں کا کھیل نہیں ہے کہ اسے قطرے میں دریا اور جزو میں کل نہ دکھائی دے یعنی دیدۂ بینا کو ضرور جزو میں کل دکھائی دیگا۔

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

* * *

اسد! ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشتِ خار اپنا
پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

بخشش الٰہی کی نذر کے واسطے ہمارے پاس صرف شرم نارسائی کا تحفہ ہے۔ دوسرے مصرعے میں تحفے کی تشریح کردی ہے۔ یعنی ہمارے پاس اس دعوائے پارسائی کا تحفہ ہے جو سو رنگ سے خون میں غلطیدہ ہے یعنی جس کا خون ہو چکا ہے۔

نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بے وفائی کا
بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

حسن تماشا دوست۔ وہ حسن جسے یہ پسند ہو کہ لوگ اسے دیکھیں۔ روسوا بیوفائی کا۔ فارسی ترکیب ''رسوائے بیوفائی'' کا ترجمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یار کو میرے علاوہ دوسروں کو اپنا نظارگیٔ حسن بنانا پسند ہے تو اس سے اس پر بے وفائی اور شکست عہد پارسائی کا الزام عاید نہیں ہو سکتا کیونکہ ان دیکھنے والوں کی نظریں تو گویا مہریں ہیں جن سے اس کی پارسائی کا دعویٰ ثابت ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مضمون بطریق طنز ہو۔

زکاتِ حسن دے اے جلوۂ بینش! کہ مہر آسا
چراغ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

''کہ'' یعنی ''تا کہ'' جس کے سبب سے'' استعاروں کو دور کرنے سے اس بلیغ شعر کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اپنے جلوہ دیدار سے چشم مشتاق کو روشن کر۔

نہ مارا جان کر بے جرمِ قاتل! تیری گردن پر
رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا

یعنی حق آشنائی یہ تھا کہ تو مجھ کو مار ڈالتا۔

تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا' شکوۂ بے دست و پائی کا

زبان کی تمنا متقاضی تھی کہ بے دست و پائی کی شکایت کیجائے لیکن چونکہ مجھ کو بیزبان دیکھ کر ان کو خود بخود رحم آ گیا' اس لئے تمنائے زبان بیزبانی کی سپاس گزار ہے کیونکہ بے زبانی ہی کے سبب سے شکوہ بے دست و پائی کی ضرورت باقی نہ رہی اور ان کو عرض حال اور شکایت کے بغیر ہی رحم آ گیا۔

وہی اک بات ہے جو یاں نفس' واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

دہانِ ہر بُتِ پیغارہ جُو زنجیرِ رسوائی
عدم تک بے وفا! چرچا ہے تیری بے وفائی کا

بت خود بیوفا ہوتے ہیں جب وہ بھی تجھے بیوفائی کا طعنہ دیتے ہیں تو خیال کرنا چاہیے کہ تیری بیوفائی کا درجہ کس قدر بڑھا ہوا ہے۔ زنجیر رسوائی کی ترکیب نہایت دور از کار ہے۔ غالباً مطلب اس سے یہ ہوگا کہ بتان بیوفا کے حلقہائے دہن مل کر زنجیر رسوائی بن گئے ہیں یا یہ کہ حدیث بیوفائی ایک بار ایک بت سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے تک پہنچی ہے اور اس طور پر ایک زنجیر رسوائی کی شکل نمودار ہوگئی ہے۔

نہ دے نامے کو اتنا طول غالب مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا

یعنی ستم ہائے جدائی کے بیان کرنے کی حسرت رکھتا ہوں۔ اس میں اشارہ اس امر کی جانب ہے کہ ان کی کثرت کی وجہ سے بیان سے قاصر ہوں۔

○

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا
بے تکلف داغِ مہ مہرِ دہاں ہو جائے گا

مہر دہاں، مہر خاموشی، داغ ماہ کو بہ اعتبار سیاہی و شباہت مہر سے تعبیر کیا ہے مطلب یہ ہے کہ اگر شب فرقت کا اندوہ میں ادا نہ کر سکوں تو یہ سمجھنا چاہیے کہ چاند کا داغ میرے لئے گویا مہر خاموشی بن گیا تھا۔

زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب
پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائے گا

چاندنی کا زہرہ آب ہو کر سیل کی صورت ہو جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ ہجر یار میں چاندنی موج آزار و بربادی ہو جائے گی۔

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ، مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

ایک مطلب اس شعر کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر محبوب خواب میں آئے اور میں اس کے پاؤں کا بوسہ لے لوں تو وہ بدگماں ہو کر خواب میں بھی آنا چھوڑ دیگا۔

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے، کیا معلوم تھا
یعنی، یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا
سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا
گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط
شعلہ خس میں، جیسے خوں رگ میں، نہاں ہو جائے گا

نگاہ گرم یعنی نظر عتاب جس کے خوف سے خون رگ میں اس طرح نہاں ہو جائے گا جیسے شعلہ خس میں ہوتا ہے۔

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا
وائے! گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا
فائدہ کیا؟ سوچ آخر تو بھی دانا ہے، اسد!
دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہو جائے گا

○

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا تو کچھ برا نہ ہوا کیونکہ اگر اچھا ہو جاتا تو مجھے دوا کا احسان مند ہونا پڑتا حالانکہ وہ دوا کا احسان لینا مجھے منظور نہیں۔

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟
اک تماشا ہوا' گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں؟
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

بندگی یعنی عبودیت' بندگی پر نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے کہتا ہیکہ میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھکو سوا نقصان کے کچھ فائدہ نہ پہنچا۔ (یادگار غالب)

جان دی' دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گردب گیا' لہو نہ تھما
کام گر رک گیا' روا نہ ہوا

کام جب رک جاتا ہے تو روا نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے زخم کے دب جانے پر چاہیے تھا کہ لہو بھی رواں نہ ہوتا لیکن یہاں ایسا نہیں اور زخم کے دب جانے پر بھی لہو جاری ہے۔

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے؟
لے کے دل، دل ستاں روانہ ہوا
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

○

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا
گہر میں محو ہوا، اضطراب دریا کا

دل میں بھی یعنی اگرچہ وسعت دل مشہور ہے گہر کو دل سے اور شوق کو اضطراب دریا سے مشابہ کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دل میں اضطراب شوق کو درخور حوصلہ جگہ نہ ملنے سے اس کا جوش باقی نہ رہا۔ گویا دریا گہر میں سما گیا۔

میں جانتا ہوں کہ، تو اور پاسخِ مکتوب!
مگر، ستم زدہ ہوں، ذوقِ خامہ فرسا کا

پاسخ مکتوب یعنی جواب خط مطلب یہ ہے کہ شوق کی خامہ فرسائی سے مجبور ہوں ورنہ یہ تو معلوم ہے کہ جواب خط نہ دیگا۔

حنائے پائے خزاں ہے، بہار اگر ہے یہی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے، عیش دنیا کا

بہار کی بوجہ رنگینی "حنائے پائے خزاں" کہا۔ کہتا ہے کہ دنیا کا عیش آخر کار ہمیشہ کلفت خاطر کا باعث ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً بہار ہی کو لے لیجئے کہ وہ گویا پائے خزاں کی حنا ہوتی ہے جس کی رنگینی چندروز میں زائل ہو جاتی ہے اور پھر خزاں ہی کا دور دورہ رہتا ہے۔

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

خندہ گل کو خندہ بیجا اس نے کہا کہ وہ کچھ سمجھ کر یا از راہ تعجب نہیں ہنستا ہے پس اس کا خندہ بے محل ہے (یادگار غالب)

ہنوز محرمیِ حسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا

مصرع ثانی کے شروع میں "باوجودیکہ" یا "اگرچہ" بڑھا کر پڑھنے سے مطلب صاف ہو جاتا ہے۔

دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا!

تقاضا کا اب بالکل متروک ہے تقاضے کا چاہیے غالباً قافیے کی ضرورت نے مرزا کو مجبور کیا ہوگا۔

نہ کہہ کہ گریہ بہ مقدارِ حسرتِ دل ہے
مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

مطلب یہ ہے کہ اگرچہ شدت گریہ کی وجہ سے میری آنکھوں سے دریا رواں ہے پھر بھی وہ میری حسرت دل بہت بڑھی ہوئی ہے کثرت اشک سے اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ!
جفا میں اس کی ہے اندازِ کار فرما کا

یعنی فلک کو دیکھ کر وہ یاد آتا ہے کیونکہ جو کچھ ستم فلک کرتا ہے اسی کے حکم سے کرتا ہے۔

○

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

جب ساغرِ مے حبِ یار سے ملا تو قطرہ ہائے مے بہ فرطِ حیرت منجمد ہو کر گویا گوہر بن گئے اور خطِ جام رشتۂ گوہر کے مانند ہو گیا۔

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

○

جب بہ تقریبِ سفر یار نے محمل باندھا
تپشِ شوق نے ہر ذرّہ پہ اک دل باندھا

اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز
جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا

عکسِ روئے یار کی وجہ سے آئینہ گویا ایک حیرت کدہ بن گیا ہے اور یار کی شوخیِ ناز کے اثر سے جوہرِ آئینہ اس حیرت کدۂ آئینہ میں طوطیِ بسمل کے مانند پھڑک رہا ہے۔ جوہرِ آئینہ کو اس کی بیتابی ظاہر کے اعتبار سے طوطیِ بسمل سے مشابہ کیا ہے اس میں ایک نازک اشارہ اس امر کی جانب بھی ہے کہ نازِ یار کی شوخی اربابِ شوق کی حیرت کو اضطراب سے بدل دیا کرتی ہے۔

یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا
عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

دلِ سائل کو ایک طلسم اور جنگ گاہِ یاس و امید قرار دیا ہے۔ اس طلسم کی بانی پست ہمتی ہے کیونکہ یہی اکثر محرکِ سوال ہوا کرتی ہے اور اس میدانِ عربدہ میں امیدِ قبول اور یاسِ ردِ سوال کے درمیان باہم جنگ ہوا کرتی ہے۔

نہ بندھے تشنگیِ ذوق کے مضموں، غالب!
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

○

میں، اور بزمِ مے سے، یوں تشنہ کام آؤں!
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا

یعنی اس نے زبردستی کیوں نہ پلادی (یادگارِ غالب)

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

درماندگی میں غالبؔ! کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

○

گھر ہمارا، جو نہ روتے بھی، تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

ہمارا گھر جو کثرتِ گریہ سے دریا ہو رہا ہے اگر نہ روتے تو بیاباں ہوتا یعنی ویرانی بہرحال باقی رہتی۔

تنگیِ دل کا گلا کیا؟ یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا، تو پریشاں ہوتا

بعدِ یک عمرِ ورع بار تو دیتا، بارے
کاش! رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

○

نہ تھا کچھ، تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا، تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں، تو کیا ہوتا!

جب دنیا میں کچھ نہ تھا تو خدا ہی تھا اور اگر موجودات عالم کا ظہور نہ ہوتا تب بھی خدا ہی خدا ہوتا۔ پس غالبؔ کہتا ہے کہ میری ہستی ظاہر نے مجھ کو ایک شے دیگر قرار دیکر برباد کر دیا کیونکہ اگر پیدا نہ ہوتا تو خیال کرنا چاہیے کہ کیا ہوتا۔ ظاہر ہے کہ خدا ہوتا۔ (یعنی ذات الٰہی کا ایک جزو رہتا) کیونکہ پہلے ہی طے ہو چکا ہے کہ اگر کچھ نہ ہوتا تو خدا ہی خدا ہوتا۔

ہوا جب غم سے یوں بے حس، تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے، تو زانو پر دھرا ہوتا
ہوئی مدت کہ غالبؔ مر گیا، پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ ''یوں ہوتا، تو کیا ہوتا؟''

○

یک ذرۂ زمیں نہیں بے کار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالہ کے داغ کا

موسم بہار کا ذکر کرتا ہے کہ آج کل باغ کا ایک ذرہ زمین بھی بیکار نہیں ہے مثلاً باغ کی روشوں پر آمد و رفت مردم کی وجہ سے کچھ نہیں اگتا لیکن اس زمانے میں جوشِ گل کی یہ کیفیت کہ روشیں بھی گلہائے سرخ کی کثرت کی وجہ سے گویا لالے کے داغ کا فتیلہ بنی ہوئی ہیں۔ واللہ اعلم۔ فتیلہ یا فلیتہ۔ یعنی بتی جو بہت جلد آگ قبول کرنے (غیاث) یہاں جادۂ چمن کو فتیلہ کہا گویا اس سے لالے کے داغ روشن ہوتے ہیں۔

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی
کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا

آشوب بمعنی شور و غوغا۔ آگاہی کو آشوب قرار دیا جسکی برداشت کیلئے مے ساری لازم ٹھہری۔ اور ظاہر ہے کہ اس غرض کے لئے ایک ساغر سے کیا کام چل سکتا ہے خصوصاً ایسی حالت میں کہ ساغر بھی لبریز نہ ہو بلکہ صرف حد مقررہ (خط ساغر) تک شراب سے پر ہو۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا
تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے
تریاکیِ قدیم ہوں دودِ چراغ کا

دودِ چراغ کو تریاک اور اس تریاک کے نشہ کو فکرِ سخن قرار دیا۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے مدتوں چراغ کے سامنے بیٹھ کر رات بھر فکرِ سخن کی ہے۔

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا
بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار
یہ مے کدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

آنکھ کو میکدے سے اور خونِ دل کو شراب سے مشابہ کیا ہے۔ جس طرح سے کہ میکدہ بغیر شراب کے ویران ہوتا ہے اسی طرح میری آنکھوں میں خوں فشانی کے بغیر گویا خاک اڑ رہی ہے۔ موج لگانا کی تشبیہ غبار سے بہت مناسب ہے اور میکدے کے لئے خراب کا لفظ بھی کیفیت سے خالی نہیں۔

باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار خم کدہ کس کے دماغ کا؟

ابر بہار میری مستی کا باعث نہیں ہو سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ میرے سرورِ دل کا موجب تیرے حسن کا شگفتہ باغ ہے اس کے سوا اور کوئی شے میری مستی کا باعث نہیں ہو سکتی۔

○

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا
رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا

جس طرح عنوان کی بے ربطی سے مضمون خط کی آشفتگی کا حال کھل جاتا ہے اسی طرح میری چین جبیں سے میرے غم پنہاں کا حال یار پر ظاہر ہو گیا۔ چین جبین کی تشبیہ عنوان سے بہت مناسب ہے۔

یک الف بیش نہیں صیقلِ آینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

یعنی جب سے میں نے گریبان کی حقیقت سمجھی ہے اسے چاک کر رہا ہوں لیکن ہنوز صیقل آئینہ ایک الف سے زیادہ نہیں ہے۔ استعاروں کو حذف کرنے کے بعد یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ باوجود ترک تعلقات صفائی باطن خاطر خواہ حاصل نہیں ہوئی۔ واللہ اعلم

شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

بد گمانی نے نہ چاہا اسے سرگرمِ خرام
رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

بدگمانی شوق نے یار کا مصروف خرام ہونا نہ چاہا کیونکہ خرام سے قطرہ ہائے عرق جبین یار پر نمودار ہو جاتے جو دیدہ ہائے حیراں سے مشابہت رکھتے۔ پس رشک کو ان کا وجود بھی گوارا نہ ہوا۔

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہو گا
نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

اپنی عاجزی کو خس سے اور اس کی بدخوئی کو شعلۂ لرزاں سے مشابہ کیا ہے۔ ۱۲

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا

جب سفر کے تکان کا غلبہ ہوتا ہے تو مسافر دم لینے کے لئے سایہ تلاش کرتا ہے۔ یہاں جب سفر عشق میں ضعف راحت طلب ہوا تو شاعر کہتا ہے میں اپنے سایہ کو آرام گاہ سمجھا۔

اس بیان سے اپنی کمال مجبوری کو ظاہر کرتا ہے یعنی عشق کا سخت سفر اس میں ضعف کا غلبہ اور آرام کے لئے سایہ کی تلاش۔ وہاں سایہ کا ناپید ہونا اور مجبورا خود اپنے سائے کو شبستاں سمجھنا۔ استعاروں کو دور کرنے سے اس شعر کے مضمون سے یہ اشارہ پیدا ہوتا ہے کہ غایت محرومی کی حالت میں انسان یاس و ناامیدی کو اپنا ہمدم بنا کر انہیں سے تسکین طلب ہوتا ہے۔

تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ
دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

گویا مژگاں یار کو پیکان قضا قرار دیا جس سے گریز کرنا بے سود تھا۔

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار، اسدؔ!
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

○

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل، جگر تشنۂ فریاد آیا

جگر تشنہ بمعنی تشنہ جگر آرزومند۔ مطلب یہ ہے کہ دیدۂ تر کی یاد نے پھر دل کو فریاد کا آرزومند بنا دیا۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

پھر ترا وقت سفر یاد آیا۔ یعنی پھر قیامت برپا ہوئی۔ دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گزری تھی اور جو اس کے چلے جانے کے بعد وہ رہ کر یاد آتی ہے اس میں جو کبھی کبھی وقفہ ہو جاتا ہے اس کو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا ہے۔ (یادگار غالب)

سادگی ہائے تمنا، یعنی
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

اپنی تمنا کی سادگی کا ذکر کرتا ہے کہ تمنا کو نظر یار کی نیرنگیوں کا علم ہے لیکن پھر بھی وہ اسی نیرنگ نظر کو یاد کرتی ہے۔

عذرِ واماندگی، اے حسرتِ دل
نالہ کرتا تھا، جگر یاد آیا

حسرت دل کا تقاضا تھا کہ نالہ کیا جائے لیکن غالب واماندگی کا عذر پیش کر کے کہتا ہے کہ آمادہ فریاد تھا لیکن اپنی کمزوری جگر کو یاد کر کے رہ گیا کیونکہ اس میں طاقت نالہ باقی نہیں۔۱۲

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

جب کامگاری ممکن ہی نہیں ہے تو تیرا رہگزر بیکار یاد آتا ہے یعنی جب وہاں بھی زندگی بحالت ناکامی بسر ہوگی تو اس کا یاد آنا عبث ہے یوں بھی زندگی کسی نہ کسی طور پر گزر ہی جاتی۔۱۲

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی!
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

یعنی اس بحث میں کہ مکان یار اور خلد میں سے کون بہتر ہے۔

آہ، وہ جرأتِ فریاد کہاں
دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

دل میں جرأت فریاد نہ رہی تھی اس بناء پر اس سے تنگ آ کر جگر یاد آیا کہ اس میں فریاد کی طاقت دل سے زیادہ تھی۔ لیکن افسوس کہ اب جگر میں بھی یارائے فریاد نہیں۔

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے!
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

یعنی دشت ویرانی میں گھر سے مشابہ ہے۔

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ!
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

سر یاد آیا تھا یعنی اپنا سر کہ کبھی ہم بھی بربنائے شوریدہ سری اسی طرح نشانۂ سنگ طفلاں ہوں گے یا یہ کہ مجنوں کے بجائے اپنے ہی سر میں پتھر مار لیا۔

○

ہوئی تاخیر، تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بے جا ہے، مجھے اپنی تباہی کا گلا
اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو، تو پتا بتلا دوں!
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گراں باریِ زنجیر بھی تھا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا!
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یعنی ان کو لازم تھا کہ تقریر بھی کرتے کیونکہ میں مشتاق تقریر تھا۔ یہ کیا کہ وہ دفعتاً آئے اور چلے گئے۔ گویا ایک بجلی سی کوند گئی۔

یوسف اس کو کہوں، اور کچھ نہ کہے، خیر ہوئی!
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا ولے طالبِ تاثیر بھی تھا

''دیکھ غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا'' کیونکہ اس کی فریاد بھی بے اثر ہے۔

پیشہ میں عیب نہیں، رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں، وہ جواں میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے، پاس نہ آیا نہ سہی
آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

یعنی ایک تیر ہی لگا دیا ہوتا۔ اس میں تو پاس آنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟

فرشتوں کی تحریر پر یعنی کراماً کاتبین کی تحریر پر۔

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو، غالب!
کہتے ہیں، اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

○

لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا
زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا

میں گویا لبِ خشک ہوں ان لوگوں کا جو تشنگی میں مر گئے اور میں گویا زیارت کدہ ہوں آزردہ دل لوگوں کا۔ اس بیان سے اظہارِ محرومی منظور ہے۔

ہمہ ناامیدی، ہمہ بد گمانی
میں دل ہوں، فریبِ وفا خوردگاں کا

جو لوگ وفا کا فریب کھائے ہوئے ہوتے ہیں ان کا دل ہمہ ناامیدی و ہمہ بدگمانی ہوتا ہے یعنی ہر امر میں یاس و ناامیدی ہوتا ہے۔ غالب کہتا ہے کہ میں گویا وہی دل ہوں۔

○

تو دوست کسی کا بھی، ستم گر! نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

ظاہر مطلب یہ ہے کہ تو کسی کا دوست نہیں ہے اور تیرا جور بھی مجھی پر نہیں بلکہ اوروں پر بھی ہے اور مجھ سے زیادہ ہے۔ لیکن حقیقت میں غالب ایک نہایت نازک مطلب کو ادا کر رہا ہے کہتا ہے کہ جو ظلم مجھ پر نہیں ہوا وہ تو اوروں پر کر رہا ہے مجھے چونکہ شرکت اغیار کسی صورت سے گوارا نہیں ہے اس لئے تیرا ظلم نہ کرنا بھی گویا مجھ پر ایک ظلم عظیم ہے۔ پس معلوم ہو گیا کہ میرے متعلق تیرا ترک جور بر بنائے دوستی نہیں ہے۔

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

ماہِ نخشب یعنی وہ چاند جسے حکیم ابن عطا مشہور بہ ابن مقنع نے سیماب وغیرہ اشیاء سے بہ مقام نخشب تیار کیا تھا۔ یہ چاند دو ماہ تک برابر ایک چاہ سے نکلا کرتا تھا۔ لیکن روشنی اس کی چار فرسنگ سے زیادہ نہ جا سکتی تھی اور اصلی چاند کے مقابلے میں بالکل ناقص تھا۔ شاعر اس شعر میں خورشید کو روئے یار کے مقابلے میں ناقص قرار دیکر ماہِ نخشب سے تشبیہ دیتا ہے۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

دعوی یہ ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتی ہے اس کے موافق اس کی تائید غیب سے ہوتی ہے

اور ثبوت یہ ہے کہ قطرۂ اشک جس کو آنکھوں میں جگہ ملی ہے، اگر اس کی ہمت، جبکہ وہ دریا میں تھا موتی بننے پر قانع ہو جاتی ہے تو اس کو جیسا ظاہر ہے، یہ درجہ آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہ ہوتا۔ (یادگار غالب)

جب تک کہ نہ دیکھا تھا، قدِ یار کا عالم
میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
میں سادہ دل، آزردگیِ یار سے خوش ہوں
یعنی سبقِ شوق مکرر نہ ہوا تھا

میری سادہ دلی دیکھئے کہ میں آزردگی یار سے خوش ہوں۔ کیونکہ مجھے امید ہے کہ صلح شوق کے بعد سبق عشق کی تکرار میں بڑا لطف آئے گا۔ یعنی پھر سے محبت شروع ہوگی اور گویا آغاز محبت سے لے کر انتہائے محبت تک کی ساری کیفیتیں ایک بار پھر پیدا ہوں گی۔

دریائے معاصی، تنک آبی سے، ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی، ابھی تر نہ ہوا تھا

کہتا ہے کہ گناہ کرنے میں ہمارا حوصلہ اس قدر فراخ ہے کہ باوجودیکہ دریائے معاصی خشک ہو گیا مگر ابھی ہمارے دامن کا پلہ تک نہیں بھیگا (یادگار غالب از مولانا حالی)

جاری تھی، اسد! داغِ جگر سے مرے تحصیل
آتش کدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

سمندر چوہے کی قسم کا ایک جانور جس کی نسبت مشہور ہے کہ آتشکدوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے غالب کہتا ہے کہ میں اس وقت سے داغ جگر سے تحصیل آتش مزاجی کر رہا ہوں کہ سمندر کا وجود بھی نہ تھا۔ اپنا سمندر سے اور داغِ جگر کا آتش سے مقابلہ کیا ہے۔

○

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا
رشتہ ہر شمع، خارِ کسوتِ فانوس تھا

ناموس بمعنی عفت و عصمت۔ رشتۂ شمع وہ تاگا جو موم بتی میں ہوتا ہے کسوت بمعنی لباس خار در پیرہن بودن محاورہ فارسی ہے جس کے معنے بیچین ہونے کے ہیں۔ اسی کو غالب نے اردو میں لیا ہے۔ کہتا ہے کہ شب کو کہ عصمت و عفت کی محفل خلوت میں محبوب بزم افروز تھا۔ اس وقت شمع کی یہ حالت تھی کہ اس کا ہر رشتہ اس کے حق میں خار پیراہن ہو گیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کی خلوت ناموس میں (جہاں کسی کا گزر نہیں) شمع کی بھی بیقراری سے کچھ عجب حالت ہو گئی تھی۔

مشہد عاشق سے کوسوں تک جو اگتی ہے حنا
کس قدر یارب! ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

یہ جو شہد عاشق سے کوسوں تک حنا اگتی ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسے پابوسی کی حسرت کس قدر تھی۔ یعنی زندگی میں پابوسی یار حاصل نہ ہو سکی تو اب شاید اس طرح پر ہر جائے کہ اس کے شہد پر جو حنا اگتی ہے وہ کسی دن پائے یار تک پہنچے بقول۔

بوسم منِ بے برگِ و نوا برگِ حنا را
تا بوسہ بہ پیغام وہم آں کفِ پا را

حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو
دل بہ دل پیوستہ گویا یک لبِ افسوس تھا

ہم نے محبت کا نتیجہ سوا اس کے اور کچھ نہ دیکھا کہ آخر کار آرزوؤں کا خون ہو گیا گویا عاشق اور معشوق دونوں کے دل مل کر لب افسوس بن جاتے ہیں جس سے اظہار افسوس کے سوا کچھ ممکن نہیں ہوتا

کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

غذا ہضم ہونے اور خون بننے سے پہلے طبخ اول میں کیلوس کی شکل اختیار کر کے آش کے ماخذ اور اس کے بعد طبخ دوم میں کیموس کی صورت پا کر پانی کے مانند ہو جاتی ہے اور خون کی شکل اختیار کرتی ہے۔

غالب بیماری غم عشق کی فراغت کا ذکر کرتا ہے کہ خون دل کے کھانے میں کیلوس کیموس وغیرہ

کے جھگڑے پیش نہیں آتے اور ابتدا ہی سے خون جگر کھایا کیے۔

○

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے
اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

"قاصد کو گردن ماریے" یعنی "قاصد را گردن مزن۔"

○

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

نیاز یعنی نیازمندی، جس دل پہ ناز تھا مجھے یعنی جو ناز برداریِ یار کا متحمل تھا۔

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا
مرنے کی اے دل! اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا
بر روئے شش جہت درِ آئنہ باز ہے
یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

بر روئے شش جہت یعنی ہر شخص کے لئے۔ یاں یعنی خانہ آئینہ میں۔

واکر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

یعنی اب بھی اگر دیدارِ حسن نصیب نہ ہو تو اپنی نگاہ قاصر کا قصور ہے۔ یا یہ کہ اور سب حجاب اٹھ سکے ہیں صرف حجابِ نگاہ باقی ہے۔ یہ بھی اٹھ جائے تو پھر شاہد و مشہود میں کوئی فرق باقی نہ رہے۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

یعنی باوجود مکروہاتِ زمانہ کے ہجوم کے تیری یاد دل سے نہ گئی۔

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

واں یعنی کشتِ وفا میں۔ ہوا بمعنی آرزو۔ مطلب یہ ہے کہ اب آرزوئے وفا ہی نکل گئی کیوں کہ وفا سے بھی بجز حسرت اور کچھ حاصل نہ ہوا۔

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا، مگر اسدؔ!
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

○

رشک کہتا ہے کہ "اسکا غیر سے اخلاص، حیف!"
عقل کہتی ہے کہ "وہ بے مہر کس کا آشنا!"

اغیار کے ساتھ محبوب کا ربط ضبط دیکھ کر عاشق رشک اور افسوس کرتا ہے۔ لیکن پھر عقل کہتی ہے کہ رقیب کے ساتھ بھی اس کا اخلاص واقعی نہیں ہے کیونکہ وہ بے مہر بھلا کس کا آشنا ہوتا ہے۔

ذرہ ذرہ ساغرِ مے خانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا

جس طرح گردش مجنوں چشم لیلیٰ کے اشارے کی پابند تھی اس طرح دنیا میں ذرہ ذرہ نیرنگیٔ عالم کا تابعدار ہے۔ مصرعہ ثانی مثال تشریحی ہے۔

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرّہ صحرا دست گاہ و قطرہ دریا آشنا

عشق کی بابت کہتا ہے کہ ارباب عجز کی نازش کا سامان اسی شوق کے ذریعہ سے مہیا ہوتا ہے کیونکہ اس کی بدولت قطرہ دریا اور ذرہ صحرا ہو جاتا ہے عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے (حسرت) مہر ذروں کو کیا قطروں کو دریا کر دیا۔

شکوہ سنجِ رشک ہم دیگر نہ رہنا چاہیے
میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

میں' اور اک آفت کا ٹکڑا' وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

یعنی اب میرا اور اس دل کا ساتھ ہے جو دشمن عافیت ہے اور آشنائے وحشت۔ پہلے مصرعے میں' اور' عطف ملازمت۔

کوہ کن' نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسؔد!
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

کوہکن نے اس قدر عرق ریزی کی پھر بھی تمثال سنگ شیریں کو پیدا کر سکا نہ کہ خود شیریں کو اس میں اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ فرہاد کا عشق کامل نہ تھا ورنہ خود شیریں کا پیدا ہو جانا کچھ بعید نہ تھا۔

○

ذکر اس پری وش کا' اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب' آخر' تھا جو رازداں اپنا

مے وہ کیوں بہت پیتے بزم غیر میں یارب!
آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

بزم غیر میں بہ کثرت شراب نوشی سے محبوب کو اپنی مے کشی اور خودداری کا امتحان منظور ہے۔ غالب بہ طرز شکوہ کہتا ہے کہ یہ بھی خوبی قسمت دیکھئے کہ آج ہی ان کو اپنا امتحان منظور ہوا جبکہ وہ بزم غیر میں ہیں۔ کاش کہ ایسا امتحان میرے ساتھ کرتے اور میرے ساتھ شراب پی کر بے ہوش ہوتے۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

یعنی خوب ہی ہوا کہ معشوق کے در کا پاسبان ہمارا جانا پہچانا نکلا۔ اب ہمارے لئے اس بات کا موقع حاصل ہے کہ وہ جس قدر چاہے ذلت ہم کو دے ہم اس کو ہنسی میں ٹالتے رہیں گے اور یہ ظاہر کرتے رہیں گے کہ ہمارا قدیم آشنا ہے، ہمارا اس کا قدیم سے ہی برتاؤ ہے۔ (یادگار غالب)

درد دل لکھوں کب تک! جاؤں ان کو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا
ننگِ سجدہ سے میرے، سنگِ آستاں اپنا

تا کرے نہ غمازی، کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں، ہم نے ہم زباں اپنا

رقیب کو شکایت کی ضرورت نہیں لیکن جب ہم اس کے سامنے جفائے یار کی شکایت کرتے ہیں تو اس قسم کی باتیں کرتے ہیں جس سے ثابت ہو کہ ہمارے رائے میں اسے بھی موقع شکایت

حاصل ہے اور اس طرح پر ستم یار کے معاملے میں اسے بھی اپنا ہم زبان بنا لیتے ہیں کیونکہ اگر ایسا نہ کریں تو وہ یعنی رقیب ہمارے اس شکوہ وشکایت کی خبر یار تک پہنچا دے۔

ہم کہاں کے دانا تھے! کس ہنر میں یکتا تھے!
بے سبب ہوا غالب! دشمن آسماں اپنا

○

سرمۂ مفت نظر ہوں، مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا
رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم!
تیرے چہرے سے ہو ظاہر، غمِ پنہاں میرا!

یعنی کہیں ایسا نہ ہو کہ ضبط غم کی وجہ سے مر جاؤں اور تجھے رنج ہو اور اس طرح تیرے چہرے سے میرا غم پنہاں ظاہر ہو۔ یا یہ معنی ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں ضبط غم کروں اور اس کے اثر سے تیرے دل پر بھی چوٹ لگے جس کا اثر تیرے چہرے سے نمایاں ہوں۔

○

غافل بہ وہمِ نازِ خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طُرّہ گیاہ کا

غافل اپنی کاروائی پر ناز کرتا ہے حالانکہ جب دنیا میں ایک طرۂ گیاہ بھی ایسا نہیں ہے جس کو صبا شانہ کر کے آراستہ نہ کرتی ہو تو ایسی حالت میں انسان کے لئے اپنی کامیابی پر ناز کرنا غفلت اور حماقت کی دلیل ہے چاہیے یہ کہ تمام کامرانیاں لطف الٰہی کی جانب منسوب کیجائیں۔

بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ
صیدِ ز دام جستہ ہے، اس دام گاہ کا

تمنا نہ رکھ فارسی ترکیب کا ترجمہ ہے۔ یعنی تمنا نہ کر۔ صید زدام جستہ وہ شکار جو دام سے نکل گیا ہو۔ کہتا ہے بزم مے نوشی سے عیش کی امید نہ رکھ کیونکہ اس بزم کا رنگ ایک ایسا شکار ہے جو قبضے میں نہیں رہ سکتا یعنی محفل عشرت کے رنگ کو ثبات نہیں ہے اس لئے اس سے عیش کی امید بیکار ہے۔

رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے!
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

کہتا ہے کہ ہم شرمندگی گناہ کی وجہ سے عذر گناہ نہیں کرتے کیا عجب ہے کہ رحمت الٰہی شرمندگی کے سبب سے ہمارے اس عذر گناہ کرنے ہی کو قبول کرے۔

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُر گل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

اپنے شوق شہادت کا اظہار کرتا ہے کہ زخموں کی بہار میری نظروں میں ہے جس سے (گویا) نگاہ کا دامن پُراز گل ہو گیا ہے۔ زخم کو پھول سے مشابہ کیا ہے۔

جاں در ہوائے یک نگہِ گرم ہے اسدؔ!
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

ہوا بہ معنی شوق۔ تیرے داد خواہ کا یعنی اسد کا۔ پروانے کو وکیل بنایا کیونکہ وہ شمع کا عاشق بھی جل کر اپنی جان دے دیتا ہے اور گویا ''جان در ہوائے یک نگہ گرم کا مصداق ہوتا ہے۔

○

جور سے باز آئے، پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ''ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا!''

وہ اپنی جفا سے اب اس قدر شرمندہ ہیں کہ مجھ سے کہتے ہیں کہ ''اب ہم تجھے کیا منہ دکھلائیں۔'' پس غالب کہتا ہے کہ وہ جور و ستم سے باز آنے پر بھی باز نہ آئے کیونکہ شرم ستم کی بنا پر ان کا منہ نہ دکھلانا یہ بھی مجھ پر ظلم ہے۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
لاگ ہو، تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی، تو دھوکا کھائیں کیا
ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ؟
یارب! اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا
موجِ خوں، سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا!
عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر، دیکھیے دکھلائیں کیا

انھوں نے عمر بھر تو مجھ کو مرنے کی راہ دکھلائی اب میرے مرجانے پر دیکھئے کیا دکھلاتے ہیں۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

○

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

بغیر کثافت کے لطافت جلوہ گر نہیں ہو سکتی۔ مصرعہ ثانی اس بیان کا مثالی ثبوت ہے اس طور پر کہ باد بہاری کا جلوہ چمن کے ذریعہ سے نمودار ہوتا ہے۔ حالانکہ چمن باعتبار اپنی سبزی کے گویا آئینہ باد بہاری کا زنگار ہوتا ہے۔ دکھانا یہ ہے کہ یہاں بھی کثافت وزنگار چمن کے بغیر لطافت (باد بہار) جلوہ گر نہ ہوئی۔

حریفِ جوششِ دریا نہیں، خودداریِ ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

جس طرح سے جوشش دریا کے مقابلے میں ساحل اپنے کو غرق آب ہونے سے روک نہیں سکتا اسی طرح سے جہاں تو ساقی ہو وہاں ہوشیاری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔

○

عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

جب درد حد سے گزر جائے تو وہ صاحب درد کی ذات کو فنا کر دیگا اور اس کے لئے درد باقی نہ رہے گا۔ اس طرح پر درد کا حد سے گزرنا در حقیقت دوا ہو جانا ہے کیونکہ فنا ہو کر قطرہ دریا سے مل جائے گا اور جزو کا کل میں فنا ہو جانا عین مقصود ہے۔

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

قفل ابجد ایک قسم کا قفل ہوتا ہے جس میں حلقوں پر حروف ابجد کندہ ہوتے ہیں اور جب تک یہ سب حروف بہ ترتیب مقررہ نہیں ملتے قفل نہیں کھلتا۔ اس شعر میں "بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا" اسی رعایت سے آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح مقررہ لفظ کے بنتے ہی قفل ابجد کھل کر جدا ہو جاتا ہے اسی طرح بدقسمتی سے میری بات (تدبیر) کے بنتے ہی مجھے تجھ سے جدائی نصیب ہوگئی۔

دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہو جانا

زحمت دل کے دور کرنیکی اتنی کوششیں کی گئیں کہ ان کوششوں کی کثرت اور کشمکش میں دل ہی تمام ہو گیا۔ گویا ایک عقدہ تھا جس کے کھولنے کی اس درجہ کوشش کی گئی کہ کھولتے کھولتے "اس عقدہ کا وا ہونا" گھس کر رہ گیا یعنی ناممکن ہو گیا۔ قاعدہ ہے کہ زیادہ کوشش کرنے سے اکثر گرہ اور بھی سخت

ہو جاتی ہے اور اس کا کھلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ!
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا!
ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

جس طرح ابر کا برس کر کھل جانا بھلا معلوم ہوتا ہے اسی طرح غم ہجر میں رونے سے مر جانا مجھے اچھا معلوم ہوگا۔

گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچہ کی ہوس
کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا
تا کہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

آئینہ یعنی فولادی جو برسات میں سبز ہو جاتا ہے۔ ہوائے صیقل یعنی خواہش صیقل آئینے کا سبز ہو جانا ہوا کے اثر سے ہے گویا آئینہ اعجاز ہوا سے سبز ہو گیا ہے اگرچہ اس ہوا سے ہوائے صیقل یعنی خواہش صیقل ہی کیوں نہ مراد ہو۔ مقصود شاعر یہ ہے کہ آج کل اعجاز ہوا یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ بہ معنی خواہش میں بھی وہی تاثیر اور اعجاز پیدا ہو گیا ہے جو اصل ہوا میں ہوتا ہے۔

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب!
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

ردیف ’’ب‘‘

○

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب
دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

بط مے یعنی صراحی مے جو بہ شکل بط ہو۔ دل و دست شنا یعنی حوصلہ و قوت شناوری۔ مطلب یہ ہے کہ موسم برشگال آیا یعنی اب پھر وہ زمانہ آیا کہ شراب نوشی کا دور دورہ ہو۔

پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ ارباب چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

ارباب چمن یا جوانان چمن بمعنی اشجار سرسبز۔ ارباب چمن کے لئے سرمستی کا لفظ بہت مناسب ہے کیونکہ درختوں کی گہری سبزی سیاہی کی حد تک پہنچ جاتی ہے شاعر کہتا ہے یہ جو چمن میں درخت مستانہ وار جھوم رہے ہیں ان کی جنبش سرور کا سبب یہ ہے کہ سایۂ انگور میں ہو کر گزرنے کے سبب سے ہوا میں شراب کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔

جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے
سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

موج شراب کو بال ہما سے مشابہ کرتا ہے یعنی ہما کے مانند موج شراب کا بھی سر سے گزرنا دلیل بخت مندی ہے۔ موج شراب کے سر سے گزرنے میں نشے کے حد سے گزر جانے کی طرف اشارہ ہے۔ ’’بھی‘‘ کی معنوی قوت (جسے انگریزی میں لورس کہتے ہیں) اس شعر میں یہ ہے کہ اگر شراب کا استعمال باعتدال ہو تو اس کا کیا کہنا۔ لیکن اگر اس کا نشہ حد سے متجاوز ہو جائے تب بھی وہ بال ہما سے مشابہ ہے۔

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو
موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

چار موج بہ معنی گرداب۔ لطف یہ ہے کہ دوسرے مصرعے میں چار قسم کی موجوں کا ذکر بھی موجود ہے۔

جس قدر روحِ نباتی ہے جگر تشنۂ ناز
دے ہے تسکیں بدمِ آبِ بقا موجِ شراب

جگر تشنہ یا تشنہ جگری بمعنی شائق۔ روحِ نباتی یعنی قوتِ نامیہ۔ جس قدر قوتِ نمو مشتاق ناز ہے اسی قدر موج شراب (بہ دمِ آبِ بقا) اس کو تسکین دیتی ہے۔ یعنی شراب سے قوت نمو کے حسن اور اس کے ناز میں ترقی ہوتی ہے۔

بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

موج شراب جو گل سے مشابہ ہے اس کے تصور سے گزرگاہ خیال میں چراغاں کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ ہجوم گل کو چراغاں سے مشابہ کیا ہے۔

نشہ کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ
بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب

نشو و نما یعنی نشو و نمائے دماغ۔ سر بمعنی خیال و خواہش۔ یہ لفظ دماغ کی رعایت سے آیا۔ مطلب یہ ہے کہ شراب کو چونکہ نشو و نمائے دماغ کا خیال ہے اس لئے وہ بہ شکل نشہ معاینہ۔

دماغ کررہی ہے۔

ایک عالم پہ ہیں طوفانیٔ کیفیتِ فصل
موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

طوفانی یعنی جوش و خروش کا اظہار کرنے والے۔ فصل یعنی یہ موسم بارش۔

شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے موسمِ گل!
رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے خوشا موجِ شراب!

چونکہ موسم گل بھی ہنگامۂ ہستی کے مانند چند روزہ اور خوش گوار ہوتا ہے اس لئے اس کو "رہبر قطرہ بہ دریا" کہا کیونکہ فنا قطرہ کو دریا سے اور جزو کو کل سے ملا دیتی ہے۔

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسد!
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

ردیف "ت"

◆

افسوس، کہ دنداں کا کیا رزق، فلک نے
جن لوگوں کی تھی، درخورِ عقدِ گہر انگشت

جن لوگوں کی انگشت سلکِ گہر کے قابل تھی افسوس کہ فلک نے (اسے) دندان کا رزق کیا۔ یعنی افسوس کہ وہ لوگ انگشت حسرت بہ دنداں ہیں۔

کافی ہے نشانی تری چھلّے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت
لکھتا ہوں اسد! سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

◆

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت!
جگر کو مرے عشقِ خونابہ مشرب
لکھے ہے خداوندِ نعمت سلامت
علیٰ الرغمِ دشمن شہیدِ وفا ہوں
مبارک مبارک سلامت سلامت

علی الرغمِ دشمن یعنی برخلافِ خواہش رقیب۔ کیونکہ محبت میں شہید وفا ہونا ایک بہت بڑا امتیاز ہے۔ خلاف خواہش رقیب شہید وفا ہونے پر مبارکباد دیتا ہے۔

نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی!
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

سر و برگ بہ معنی سامان۔ صورت ضد معنی۔ مطلب یہ ہے کہ دریافت حقیقت کی قوت نہیں ہے تو تماشائے صورت ہی سہی۔

○

مند گئیں، کھولتے ہی کھولتے، آنکھیں، غالب!
یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت!

○

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست
دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست

(آمد خط سے حسن یار کا بازار سرد ہو گیا) اس لئے خط روئے یار کو بجھی ہوئی شمع کے دھوئیں سے مشابہ کیا۔

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست؟

خانہ ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجیے
صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

خانہ ویراں سازی خانہ خرابی۔ گھر کا اجاڑ دینا۔ رفتہ رفتار۔ رفتار پر مٹا ہوا یعنی شیدائے رفتار۔ تماشہ کیجئے فارسی محاورہ کا ترجمہ ہے یعنی ملاحظہ کیجئے۔ خود کو بہ اعتبار حیرانی و پامالی و خانہ بربادی نقش

پا سے مشابہ کیا ہے۔

عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست

چشمِ ما روشن کہ اس بے درد کا دل شاد ہے
دیدۂ پُرخوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست

مصرعہ ثانی میں "ہے" کا محذوف ہونا نہایت ناگوار ہے۔ دیدۂ پرخوں کی رعایت سے (چشم ما رَوشن) اور چشمِ ما روشن کے لحاظ سے "دل شاد" نظم کیا ہے۔

غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اس کے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غم خوارِ دوست

تا کہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک
مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ
سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے
یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

یہ غزل اپنی، مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں، غالبؔ زبس تکرارِ دوست

ردیف "ج"

○

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

حلقہ بیرون در یعنی بیرون در کی زنجیر کا حلقہ ہمارا محبوب سیر چمن کو آنے والا ہے۔ اس لئے کسی کو باغ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے اور گلوئے قمری کا طوق، گویا حلقہ بیرون در بنا ہوا ہے۔

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس، کمندِ شکارِ اثر ہے آج

تارِ نفس کی کمند نے اثر کو شکار کر لیا ہے یعنی آج ہماری آہ میں اثر پیدا ہوا ہے لیکن اس اثر کا نتیجہ الٹا ہے کہ فغاں کیساتھ ایک پارہ دل باہر آتا ہے یعنی اثر آہ سے دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے اثر آہ کے اس الٹے نتیجے کے ذکر سے اپنی بدبختی کا اظہار منظور ہے۔

اے عافیت! کنارہ کر، اے انتظام! چل
سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

چل یعنی رخصت ہو۔ کیونکہ سیلاب گریہ کے مقابلے میں عافیت وانتظام کا وجود ناممکن ہے۔

لو ہم مریضِ عشق کے بیماردار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج؟

لوگ اصرار کرتے ہیں تو لو ہم مریض عشق کی تیمارداری کرتے ہیں لیکن اگر مسیحا سے مریض عشق اچھا نہ ہوا تو پھر مسیحا کی کیا سزا۔ (معاذ اللہ)

یا یہ کہ لو ہم مریض عشق کی تیمارداری کرتے ہیں لیکن جب یہ معلوم ہے کہ وہ اچھا نہ ہوگا تو مسیحا کا کیا علاج یعنی علاج مسیحا بیکار ہے۔

ردیف "چ"

* * *

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ۔ یعنی ترک آرزو نہ کر۔ اگر شراب نہیں ہے تو انتظار ساغر ہی سہی۔ بہر حال ترکِ آرزو نہ کر۔

کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ
برنگِ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ

آئینہ یعنی میری حسرت دیدار کا جس میں جوہروں کے بدلے کانٹے ہیں جن کو کمال گرمی سعی تلاش کا نتیجہ سمجھنا چاہیے جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ زیادہ تلاش اور دوڑ دھوپ کرنے والوں کے پاؤں میں کانٹے گڑ جایا کرتے ہیں۔

تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل!
کیا ہے کس نے اشارا کہ نازِ بستر کھینچ

انسان جب مائل خواب ہوتا ہے تو اس کو بستر کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کو خواب کے لئے گویا بستر کا ناز کھینچنا پڑتا ہے۔ یہاں شاعر دل کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ تیری راحت کے لئے میل خواب اور ناز کشی کے بجائے انتظار یار کافی ہے۔

تری طرف ہے بہ حسرت نظارۂ نرگس
بکوریِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

بکوری دل وچشم رقیب، یعنی علی الرغم عدو خلاف خواہش نرگس جو تجھے بے تکلف مصروف مے نوشی دیکھنا چاہتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نرگس تیری طرف بڑی حسرت سے دیکھ رہی ہے اس لئے تجھ کو چاہیے کہ تو باغ میں اسی طرح بے تکلف شراب نوشی میں مشغول نہ ہو۔ نرگس کو اس کی نگاہ حسرت کے لحاظ سے اپنا رقیب قرار دیا ہے۔

بہ نیمِ غمزہ ادا کر حقِ ودیعتِ ناز
نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

میں نے تیرے خنجر کو پردۂ زخم جگر کے نیام میں امانت رکھا ہے اب تو بھی اس کا حق ودیعت یا مزدِ امانت ”بہ نیم غمزہ ادا کر“ لطف یہ ہے کہ نیام سے خنجر یا الف کے نکالنے کے بعد ”نیم“ باقی رہ جاتا ہے۔

مرغے بقدح میں ہے صہبائے آتش پنہاں
بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

آتش پنہاں کی شراب کے ساتھ دلِ سمندر کے کباب کی ضرورت ہے کھینچ یعنی چن دے۔

ردیف "د"

○

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد
شمع بجھتی ہے، تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

مجھ کو احوال بتاں پر افسوس آتا ہے کہ میرے بعد سوگ میں انھوں نے مہندی لگانا چھوڑ دیا ہے۔

در خورِ عرض نہیں جوہرِ بے داد کو جا
نگہِ ناز ہے سرمہ سے خفا میرے بعد

عرض یعنی کسی چیز کا کسی پر ظاہر کرنا۔ جوہر بیداد کے اظہار کے لئے اب کوئی جائے مناسب باقی نہیں رہی یعنی میرے بعد ان کے ستم ناز کا تختۂ مشق بننے کے لئے کوئی باقی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ میرے بعد انہوں نے مہندی کی طرح سرمہ لگانا بھی چھوڑ دیا ہے گویا ان کی نگاہ ناز سرمے سے خفا ہے۔

ہے جنوں اہلِ جنوں کے لیے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

آغوش وداع ہے یعنی رخصت ہو رہا ہے۔

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

مصرعۂ اول مجموعۂ الفاظ صلا ہے پہلی بار ساقی سر مالیہ لہجہ میں دریافت کرتا ہے کہ کون ہوتا ہے حریف مے مردافگن عشق یعنی کوئی ہے جو مے مردافگن عشق کا حریف ہو؟

پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اسی مصرعے کو مایوسی کے لہجے میں مکرر پڑھتا ہے کہ کون ہوتا ہے حریف مے مردافگن عشق یعنی کوئی نہیں ہوتا۔ (یادگار غالب)

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالبؔ!
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد؟

ردیف "ر"

○

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

نگاہ شوق کو در و دیوار روک نہیں سکتے بلکہ الٹے بال و پر کا کام دیتے ہیں یعنی رکاوٹوں سے شوق میں اور بھی ترقی ہوتی ہے۔

وفورِ اشک نے کاشانہ کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

دیوار و در سے در دیوار ہو گئے ہیں یعنی تہ و بالا ہو کر دیوار در ہو گئی اور دروازہ مٹی سے بند ہو کر دیوار بن گیا ہے۔

نہیں ہے سایہ کہ سن کر نویدِ مقدمِ یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

مقدم بمعنی آنا' کہ بلکہ سایہ یعنی در و دیوار کا سایہ جو استقبال کیلئے دیوار سے آگے بڑھ گیا ہے۔

ہوئی ہے کس قدر ارزانیِ مے جلوہ
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار
جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار تو آ
کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار

یعنی عشاق کی نگاہیں انتظار میں در و دیوار پر جمی ہوئی ہیں گویا در و دیوار متاع نظارہ کی دوکان بن گئے ہیں۔ اگر تجھے جنس انتظار کی خریداری منظور ہے تو آ۔

ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے؟
کہ گر پڑے نہ مرے پانو پر در و دیوار
وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں تو سایے سے
ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار

سائے سے یعنی بذریعہ سایہ۔ ایک مکان کا سایہ بڑھ کر دوسرے مکان سے اکثر مل جاتا ہے اسی سے یہ خیال پیدا ہوا۔

نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار
نہ پوچھ بے خودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار
نہ کہہ کسی سے کہ غالبؔ! نہیں زمانہ میں
حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

○

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر
کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
جانوں کسی کے دل کی میں کیوں کر کہے بغیر
کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں

لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑوں گا میں نہ اس بتِ کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

گفتگو میں مثلاً شعر و سخن میں دشنہ و خنجر سے ناز و ادا مراد لیا کرتے ہیں۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

غالبؔ نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

○

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

اس مضمون کا ایک دوسرا شعر مرزا نے لکھا ہے۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے

میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرمِ نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

عام ہو جفا یعنی عاشق صادق کے علاوہ عوام اہل ہوس پر بھی ہو۔

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

جوش رشک سے سے یعنی تلوار کی خوش قسمتی پر جو دست یار میں ہے۔

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر

موج مے کے لرزنے کی یہ وجہ تھی کہ خون خلق تیری رفتار مستانہ سے ہوا اور تیری مستی کا باعث مے نوشی تھی۔ پس گویا خون خلق گردن مینا پر ثابت ہوا۔ اسی قصور کے خیال سے وہ لرز رہی ہے۔

واحسرتا! کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زنّار باندھ سُبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

لطف مضمون یہ ہے کہ بظاہر صورت زنار تسبیح سے زیادہ ہموار ہوتی ہے کیونکہ اس میں تسبیح کی

طرح دانے نہیں ہوتے۔ تسبیح پر زنار کو ترجیح دینا شاعروں کا عام دستور ہے۔

ان آبلوں سے پانو کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

طوطی و آئینہ میں وہی نسبت ہے جو گل و بلبل میں ہے۔ زنگار اور طوطی میں سبزی کی وجہ سے مشابہت ہے' استعاروں کو دور کرنے سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ میرے دل کی افسردگی یاس و محرومی کے اثر سے ہے لیکن وہ بدگمان یہ سمجھتا ہے کہ افسردگی اور تنگ جوشی کا سبب یہ ہے کہ کسی دوسرے محبوب کی محبت میرے دل میں جاگزیں ہوگئی ہے۔

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

○

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

اول تو قطرۂ شبنم ہی کی کیا ہستی دوسرے وہ قطرہ بھی کیسا قطرہ جو خار بیاباں کی نوک پر ہو یعنی جس کا خود بخود فنا ہونا یقینی ہو۔ شاعر کہتا ہے کہ میرا دل مہر درخشاں کی زحمت پر لرزتا ہے کہ وہ ایک ایسے قطرۂ ناچیز کے فنا کرنے کی تکلیف اٹھاتا ہے گویا۔ شاہبازے بہ شکار مگسے می آید۔

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

''پھرتی ہے'' یہ ایہام ہے۔ ایک تو سفید چشم یعقوب کی جو دیوار زنداں پر شوق تلاش دیدار حضرت یوسفؑ میں پھرتی ہے۔ دوسرے سفیدی جو مکانوں پر آرائش اور صفائی کی غرض سے پھرتی ہے۔

فنا تعلیمِ درسِ بے خودی ہوں اس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

میں درس بیخودی میں تعلیم فنا اس وقت سے پاتا ہوں کہ مجنوں طفل مکتب تھا اور مکتب کی دیواروں پر بچوں کی طرح لکیریں کھنچا کرتا تھا لا اور فنا میں رعایت لفظی ہے۔

فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے
بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا
کہ پشتِ چشم سے جس کے نہ ہووے مہر عنواں پر

طومار بمعنی دفتر۔ پشت چشم کنایہ از غمزہ و اغماض۔ اقلیم الفت میں کوئی طومار ناز ایسا نہیں جس کے عنوان پر پشت چشم سے مہر نہ ہو۔ یعنی جس طرح دفتر پر مہر کا ہونا ضروری ہے اسی طرح ناز کے ساتھ آنکھ چرانا بھی ضروری ہوتا ہے'

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلود یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

ہجر یار میں ابر شفق آلود دیکھ کر بہ مقتضائے حسرت میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ گلشن پر آگ برستی تھی۔ ''اب یاد آیا'' یعنی اس وقت تک فرط صدمۂ ہجر کے سبب سے اس بات کا خیال بھی نہ آیا تھا۔

بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہو گا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

قیامت میں مردے زندہ ہو کر اٹھیں گے لیکن شاعر کہتا ہے کہ تیرے شہیدوں میں بجز ''پرواز شوقِ ناز'' اور کیا باقی رہا ہوگا جو قیامت انھیں اٹھائے گی۔ ان کے لئے تو قیامت گویا ایک ہوائے تند ہوگی جو ان کی خاک کو (جو پہلے ہی سے شوق ناد میں اڑ رہی ہے) کچھ اور بھی پریشان کر دے گی۔

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ! کیا ہوا گر اُسنے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

اس شعر کے لطف کا اندازہ قوت تحریر سے بالاتر ہے۔ محرومی اور مجبوری کی کیا خوب تصویر کھینچی ہے کہتا ہے کہ اگر ناصح ہم پر شدت اور سخت گیری کرتا ہے تو ہم اپنا گریبان چاک کر ڈالیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ناصح کی شدت کا عوض کس طور پر اور کس سے لینا چاہتا ہے اور اس میں مجبوری کیا کیا پہلو نکلتا ہے۔

○

ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

''ہوتا ہے گماں اور'' یعنی یہ گماں ہوتا ہے کہ وہ اظہار محبت اس لئے کرتے ہیں کہ ہماری فریفتگی اور عشق کا حال دریافت کرلیں جب ان کو ہمارے عشق کا یقین ہو جائے گا تو محبت کے بجائے ناز معشوقانہ شروع کر دیں گے۔

یارب! وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور
ابرو سے ہے کیا اس نگہِ ناز کو پیوند؟
ہے تیرِ مقرر مگر اس کی ہے کماں اور

نگہ ناز کو تیر قرار دیا ہے لیکن کہتا ہے اس تیر کی کمان ابرو نہیں ہے بلکہ اور ہی کچھ ہے مثلاً کمان دلربائی کہ مثل کمان قضا اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا۔

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے جائیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

یعنی تمھارے عہد میں دل فروشی اور جاں فروشی کا بازار گرم ہے۔

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

سبک دست بمعنی مشاق۔ ہم یعنی ذات یا ہمارا وجود۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک اپنی ہستی سے گزر نہ جائیں ہم راہ معرفت طے نہیں کر سکتے۔

ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور
مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ’’ہاں اور‘‘

’’ہاں اور‘‘ میں چونکہ حکم کا پہلو نکلتا ہے اس لئے ’’کہے جائیں‘‘ کا صلہ کو بھی صحیح ہے مثلاً ساتھ والوں کو کہا کہ یہ سب نقد و جنس بار کر لو‘‘ (باغ و بہار میر امن صفحہ ۷)

’’جلاد سے کہے جائیں‘‘ زیادہ فصیح سمجھا جاتا ہے۔

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور
لیتا نہ اگر دل تمھیں دیتا کوئی دم چین
کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

اس شعر کی نثر یوں ہے اگر تمھیں دل نہ دیتا (تو) کوئی دم (اور) چین لیتا اور جو (اگر) نہ مرتا

(تو) کوئی دن اور آہ و فغاں کرتا۔"

پاتے نہیں جب راہ، تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور
ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

○

صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر
تغیر آبِ برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

آب برجا ماندہ، پانی جو ایک جگہ پر ٹھہرا رہے۔ اس کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے اسی طرح سے آئینہ کی صفائے حیرت ہی سے زنگ ہویدا ہو جاتا ہے، آئینے کو پانی سے اور پانی پر کی کائی کو زنگ سے تشبیہ دی ہے۔

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

تدبیر بمعنی علاج، سامانِ عیش سے میری وحشت کا علاج نہیں ہوتا بلکہ وحشت اور بڑھ جاتی ہے اور جامِ زمردیں داغِ پلنگ معلوم ہوتا ہے۔

○

جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی!
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

چاک گریبانی کا نتیجہ عریانی ہے اور عریانی دستگیر جنوں ہے۔ پس گریبان سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ اے گریبان میں چونکہ آشنائے جنوں ہوں اس لئے اس چاک کا میری گردن پر حق ہو

گیا ہے کیونکہ اس نے مجھ کو عریاں کر کے گویا میرے جنوں کی دستگیری کی ہے۔

برنگ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

اس شعر کی نثر یوں ہے "نیرنگ بیتابی یک بال تپیدن پر برنگ کاغذ آتش زدہ ہزار آئینہ دل باندھے ہے" نیرنگ بہ معنی شعبدہ۔ بال بمعنی بازو۔

کاغذ آتش زدہ پر جل جانے کے بعد ہزاروں نقطہائے روشن نمودار ہو جاتے ہیں۔ غالب نے بال تپیدن کو کاغذ آتش زدہ سے تعبیر کیا ہے اور اس کے نقطہائے روشن کو دلوں سے مشابہ کیا۔

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

متاع بردہ یعنی لوٹی ہوئی متاع۔ یہ مضمون بالکل وقوعیات میں سے ہے جو لوگ آسودگی کے بعد مفلس ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے تئیں مظلوم و ستم رسیدہ و فلک زدہ سمجھا کرتے ہیں اور اخیر دم تک اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ ضرور کبھی نہ کبھی ہمارا انصاف ہوگا اور اقبال پھر عود کرے گا۔

(یادگار غالب)

ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

بے سبب رنج یعنی بے سبب آزردہ ہو جانے والا" مصرعہ ثانی لفظ۔ بے سبب رنج کی تشریح کرتا ہے یعنی ہم کو اس بے سبب رنج آشنا دشمن محبوب سے کام پڑا ہے جو شعاع مہر کو تار نظر قرار دے کر چشم روزن پر بدنظری کی تہمت رکھتا ہے۔۱۲

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر
اسد بسمل ہے کس انداز کا' قاتل سے کہتا ہے
کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

○

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلف برطرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

تو کہ محبوب محبوبان عالم ہے تیرے چاہنے والوں میں سے مرا کوئی ایسا رقیب نکل آئے گا جو تجھ سا حسین ہوگا۔ میں اس سے دل لگاؤں گا۔

○

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
مٹ جائے گا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور یعنی ہمارے لئے تمہاری موت کی وجہ سے آج ہی قیامت ہے۔

ہاں اے فلکِ پیر! جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور؟

تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

اس میں اشارہ یہ ہے کہ بدر بھی رفتہ رفتہ کم ہو کر غائب ہوتا ہے۔ پس تمھارا دفعتہً مر جانا قیامت ہے۔

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
مجھ سے تمھیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
گزری نہ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ! گزارا کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالبؔ!
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

ردیف ''ز''

○

فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح و مہر
ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز

جیب کفن کو صبح سے اور داغ عشق کو آفتاب سے مشابہ کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مرنے پر بھی مشغلۂ عشق باقی ہے۔۱۲

ہے ناز مفلسانِ زر از دستِ رفتہ پر
ہوں گل فروشِ شوخیِ داغ کہن ہنوز

مفلس لوگ اپنی گزشتہ امارت پر ناز کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح میں اپنے داغ ہائے کہن کو یاد کر کے ناز کیا کرتا ہوں۔

مے خانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں
خمیازہ کھینچے ہے بُتِ بے دادِ فن ہنوز

''خمیازہ کھینچے ہے بت بیدادفن ہنوز'' یعنی شراب خون کی تمنا میں۔ حالانکہ اب دل میں خون کا نشان بھی نہیں ہے۔ اس شعر میں بت بیدادگر کی خونخواری کا ذکر ہے۔

○

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں، فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب! کہ عمرِ خضر دراز

کہتا ہے کہ کسی مشکل مقصد کے حل ہونے میں تو عجز و نیاز نے کچھ کام نہ دیا ناچار اب یہی دعا

مانگیں گے کہ الٰہی خضر کی عمر دراز ہو۔ یعنی ایسی چیز طلب کریں گے جو پہلے ہی دی جا چکی ہو (یادگار غالب) خدا سے ازراہ طعن و شوخی کہتا ہے کہ اور کوئی دعا تو قبول نہ ہوئی اسی کو قبول کر۔ (یادگار غالب)

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود
ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

بہ ہرزہ یعنی بیکار۔ تیرے تصور میں نشیب و فراز ہیں۔ یعنی تیرا تصور ناتمام اور قاصر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وحدت وجود کا عقیدہ اختیار کرنا چاہیے تاکہ وجود اشیائے عالم کے متعلق تمام اوہام سے نجات حاصل ہو جائے۔

وصالِ جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں
کہ دیجے آئینہ انتظار کو پرواز

جلوہ تماشا بہ ترکیب فارسی۔ پرواز بہ معنی صیقل کہتا ہے کہ انتظار کے بعد جلوہ وصل ممکن ہے لیکن انتظار کی طاقت کس کو ہے۔

ہر ایک ذرّہ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں غالبؔ!
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

خاک انداز وہ ظرف جس میں مکان کا کوڑا کرکٹ جمع کر کے پھینکا جائے۔

* * *

وسعتِ سعیِ کرم دیکھ کہ سرتا سر خاک
گزرے ہے آبلہ پا ابرِ گہر بار ہنوز

کریموں کی کوشش کرم کی وسعت کو دیکھ کر تمام زمین پر ابر آبلہ پائی کی حالت میں بھی گہر

باری کرتا گزرتا ہے۔ قطرات باراں کی بناپر ابر کو آبلہ پا کہا۔ ظاہر یہ کرنا ہے کہ سعی کرم میں اس کے پاؤں میں آبلے پڑ گئے ہیں پھر بھی وہ بہ مقتضائے شان کرم بدستور اپنے کام میں مشغول ہے۔

یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیِ رفتار ہنوز

ہمارے نقش قدم میں گرمئ رفتار کا بخار ہنوز باقی ہے جس سے صفحۂ دشت یکسر کاغذ آتش زدہ کے مانند جل رہا ہے (وثوق صراحت۔ از جناب والہ دکنی)

○

کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز!
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز؟

یعنی جان نثاری عین ایمان ہے۔ یا یہ کہ وہ بت میرا ایمان ہے پس جان ایمان پر سے قربان۔

دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے
ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

"پہ نہ نکلا دل سے" یعنی فراموش نہ ہوا۔ اور اس کی محبت ہنوز دل میں باقی ہے۔

تاب لائے ہی! بنے گی' غالب!
واقعہ سخت ہے' اور' جان عزیز

○

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تو' اور آرائشِ خمِ کاکل
میں' اور اندیشہ ہائے دور دراز

اندیشہ ہائے دور دراز مثلاً یہ اندیشہ کہ تیری آرائش میرے کمال محبت سے بدگمانی کے باعث

ہے یعنی تو یہ سمجھتا ہے کہ مجھے گرفتار وفا رکھنے کے لئے ہنوز آرائش ظاہری کی ضرورت باقی ہے حالانکہ میری محبت اس سے مستغنی ہے۔

لافِ تمکیں، فریبِ سادہ دلی
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

مطلب یہ ہے کہ ہم بربنائے سادہ دلی ابھی تک یہی سمجھے جاتے ہیں کہ عشق میں دعوائے صبر و تمکین کا نباہنا ممکن ہے حالانکہ ایسے راز ہائے سینہ گداز کے ہوتے ہوئے تمکین و وقار کا باقی رہنا بہت مشکل ہے۔ لاف بہ معنی ادعا۔

ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
وہ بھی دن ہو کہ اس ستم گر سے
نازِ کھینچوں بجائے، حسرتِ ناز
نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز
اے ترا غمزہ یک قلم انگیز
اے ترا ظلم سر بسر انداز
تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو
ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز
مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تو غریب نواز
اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا! وہ رندِ شاہد باز

ردیف "س"

◆

مژدہ اے ذوق اسیری! کہ نظر آتا ہے
دام خالی قفس مرغ گرفتار کے پاس

دام یعنی دوسرا خالی دام جو اس غرض سے رکھا جاتا ہے کہ آزاد طائر بھی آ کو گرفتار ہو جائیں۔

جگر تشنۂ آزار تسلی نہ ہوا
جوئے خوں ہم نے بہائی بن ہر خار کے پاس

تشنہ آزار بہ معنی خواہشمند آزار یعنی ایذا دوست۔ تسلی نہ ہوا۔ ترجمہ تسلی نشد۔ یعنی تسکیں نہ ہوئی۔ ایک ایک خار کے پاس پائے روزگار سے خون کی ندیاں بہ گئیں اس پر بھی میرے ایذادست جگر کی تسکین نہ ہوئی۔

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے!
خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس
میں بھی رک رک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے
دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس
دہن شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل!
نہ کھڑے ہو جیے خوبان دل آزار کے پاس
دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس
مر گیا پھوڑ کے سر غالب وحشی ہے ہے!
بیٹھنا اس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

ردیف ''ش''

○

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگاوے خانۂ آینہ میں روے نگار آتش

روئے یار کے فروغ حسن کا ذکر کرتا ہے اگر جوہر آئینہ (جسے خس جوہر کہا) سبزہ خط سے طراوت نہ حاصل کرے تو یقیناً خانۂ آئینہ میں آگ لگ جائے۔

فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِّ مشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش

(نثر) فروغ حسن سے عاشق کی مشکل حل ہوتی ہے (مثلاً دیکھو کہ) اگر آتش پائے شمع سے خار نہ نکالے تو کبھی (وہ خار) نہ نکلے۔ (یہ اس شعر کی نثر ہوئی)

آتش کو فروغ حسن سے شمع کو عاشق سے اور رشتۂ شمع کو خار شمع سے مشابہ کیا ہے۔ جب موم بتی روشن ہوتی ہے تو رشتۂ شمع جل کر (گویا) پائے شمع سے نکل جاتا ہے یعنی آتش سے شمع کی مشکل حل ہوتی ہے۔ یا مطابق تشبیہات مذکورہ بالا فروغ حسن سے حل مشکل عاشق ہوتی ہے۔

ردیف "ع"

○

جادۂ خور کو بوقت شام ہے تارِ شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

آفتاب کے لئے شام کے وقت تار شعاع کو جادۂ راہ قرار دیا اور ماہ نو کو آغوش وداع یعنی شام کے وقت آفتاب آمادہ سفر ہے اور آسمان اسے رخصت کرنے کے لئے تیار۔

○

رخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ شمع
ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیِ شمع

رخ نگار کو گل سے مشابہ کیا اور چونکہ اسی سبب سے شمع کو سوز جاودانی ملا اس لئے آتش گل کو شمع کے لئے آب حیات قرار دیا۔

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگِ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع

یہ بات یعنی یہ کہ اہل زبان کے محاورے میں خاموشی سے مرگ مراد ہے۔ روشن ہوئی یعنی ظاہر اور ثابت ہوئی۔ شمع کی رعایت سے ''اہل زبان'' اور ''روشن ہوئی'' خوب آئے ہیں۔ شمع کا خاموش ہو جانا یہی اس کا فنا ہو جانا ہے۔ اس لئے گویا وہ بہ زبان حال کہہ رہی ہے کہ خاموشی سے مرگ مراد ہے۔

کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ قصہ تمام
بہ طرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیِ شمع

غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ!
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع

شعلہ، شمع کے لرزنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسرت پروانہ کے غم سے شمع ناتواں ہوگئی ہے۔

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے
بہ جلوہ ریزیِ باد و بہ پرفشانیِ شمع

اہتزاز یعنی جنبش سرور، بہ جلوہ ریزی و بہ پرفشانی میں بائے تشبیہی ہے یعنی جس طرح ہوا کے جلوہ ریزی سے شعلہ، شمع کو جنبش ہوتی ہے اسی طرح تیرے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے۔

نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ
شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیِ شمع

شہید بہ معنی کشتہ، خزانی، خزاں زدہ۔ گویا غم عشق کے پژمردہ داغ میں بھی ایسی بہار ہے کہ اس پر شگفتگی مٹی ہوئی ہے۔

جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع

بدگمانی یعنی یہ کہ شاید شمع بھی میری رقیب ہے اور یار پر عاشق ہے جب ہی تو وہ مجھ کو دیکھ کر جل رہتی ہے۔

ردیف "ف"

○

بیم رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش
مجبور یاں تلک ہوئے اے اختیار حیف!

نہیں کرتے وداع ہوش کیونکہ اس سے راز محبت فاش ہو جائے گا۔

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف!

ردیف "ک"

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

یوں تو دنیا میں نمک بہت پیدا ہوتا ہے لیکن ہم کو اس سے کیا۔ یہاں تو زخم دل کا سرمایہ راہ یار کی گرد ہے۔

مجھ کو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہو جیو
نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

لف ونشر مرتب ہے۔ مجھ کو نالۂ بلبل کا درد اور تجھ کو خندۂ گل کا نمک مبارک ہو۔

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک

توسن یار کے جولان پر شور کے اثر سے گرد ساحل نمک بن کر موج دریا کے زخم رشک پر نمک افشانی کر رہی ہے۔ رشک یہ کہ دریا کے جوش وخروش کی اس کے مقابلے میں کچھ ہستی نہ رہی۔

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ!
یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک

چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے
دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیرِ درد
زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سر تا پا نمک
یاد ہیں غالبؔ! تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

* * *

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہوتے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک
دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہوتے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہوتے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہوتے تک
پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہوتے تک
یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہوتے تک
ذوق ؎ کیا اعتبارِ ہستیِ ناپائدار کا   چشمک ہے برق کی کہ تبسم قرار کا
غمِ ہستی کا اسدؔ! کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

ردیف ''گ''

○

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

یعنی دل بے مدعا کے علاوہ اور کسی شے کے حاصل کرنے کی دعا نہ مانگ۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا! نہ مانگ

اسی مضمون کا ایک دوسرا شعر ہے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

ردیف "ل"

○

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

پھول بلبل کی سادگی اور کشتہ فریب وفا ہونے پر خندہ زن ہیں۔

آزادیِ نسیم مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل

غنچہ وگل کے دام میں بوئے گل گرفتار تھی۔ اب گل کے شگفتہ ہونے پر وہ حلقہ دام شکست ہو گیا اب نسیم پر از بوئے گل کو آزادی مبارک ہو۔

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا
اے وائے! نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

لوگ موج رنگ کے دھوکے میں رہے حالانکہ درحقیقت وہ گل کی نوائے خونیں اور نالہ خونچکاں تھا۔

خوش حال اس حریفِ سیہ مست کا کہ جو
رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بہ پائے گل

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیے بہار
میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل

میرا رقیب ہے کیونکہ بہار پھولوں کو اسی لیے ایجاد کرتی ہے وہ تیرے گلے کا ہار ہوں۔ یہ

موجب رشک ہے۔

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

تیرے حسن غیور کے رعب سے رنگ گل کی ادا میری نگاہ میں خون نظر آتی ہے یعنی کسی طور پسندیدہ نہیں ہے کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تیرے حسن کی غیرت اس امر کو کبھی گوارا نہ کریگی کہ اس کے مقابلے میں مجھ کو کسی اور کی ادا اچھی معلوم ہو۔

تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گل درقفائے گل

یعنی تیرے جلوے کا تماشا دیکھنے کے لئے ایک پھول دوسرے کے بعد دوڑا چلا آتا ہے۔

غالبؔ! مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گلِ جیب قبائے گل

"از دو ہم آغوشی آرزو دارم" محاورہ فارسی ہے۔ اسی لحاظ سے "ہم آغوشی کی آرزو" نہ کہا بلکہ "ان کا" ترجمہ "سے" کرکے "اس سے ہم آغوشی آرزو ہے۔" لکھا۔

ردیف "م"

◆

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

"برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم" اور ظاہر ہے کہ برق کی چشمک دم بھر سے زیادہ نہیں رہتی۔ اپنے کو آزاد قرار دیکر اس بیان سے یہ ثابت کرتا ہے کہ غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال
ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بت خانہ ہم

ورق گردانی یعنی ورق گردانندہ گنجفہ اور ورق میں رعایت لفظی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خیال اگلی صحبہائے برہم کی یاد کو دل میں تازہ رکھتا ہے۔

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

یک جہاں ہنگامہ یعنی جوش ہنگامہ۔ پیداء یعنی ظہور' مصرعہ ثانی بیان مصرعہ اول کی تشریح ہے "چراغاں شبستان دل پروانہ" کے مانند ہماری ہستی کا بھی باوجود ایں ہمہ شوراشوری پتہ نہیں ہے۔

ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

ہم نے جو جستجو چھوڑ دی ہے۔ یہ قناعت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ ضعف کی وجہ سے ہے اس لئے

''ہیں وبال آلخ''

وائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں، اسدؔ!
جانتے ہیں سینۂ پُرخوں کو زنداں خانہ ہم

○

بنالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر
متاعِ خانۂ زنجیر جُز صدا معلوم

دلبستگی یعنی تعلق خاطر جس کو زنجیر سے مشابہ کیا ہے اور کہتا ہے کہ جس طرح خانۂ زنجیر کی دولت اس کی صدا یا جھنکار کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی۔ اسی طرح تعلق خاطر کی متاع بھی نالے کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ پس اسی کو فراہم کرنا چاہیے۔ یعنی نالہ کشی اختیار کرنا چاہیے۔

○

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا، وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

''رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم'' کیونکہ دیارِ غیر میں میرا کوئی آشنا نہ تھا اس لئے اگر وہاں بیکسی اور کس مپرسی کی حالت میں موت آئی تو کچھ زیادہ ذلت نہ ہوئی یا یہ کہ وطن سے دور مارے جانے میں بیکسی کی شرم رہ گئی کیونکہ اگر وطن میں مارا جاتا تو بیکسی کی تکمیل نہ ہوتی۔

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا!
رکھ لیجو میرے دعویٰ وارستگی کی شرم

ردیف "ن"

○

لوں دامِ بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش و لے
غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

○

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ!
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

◆

کی وفا ہم سے، تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے، کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

دل میں آ جائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالہ کو رسا کہتے ہیں؟

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے
خارِ رہ کو ترے ہم مہرِ گیا کہتے ہیں

مہر گیا ایک قسم کی بوٹی ہے جس کی جڑ بہ شکل انسانی ہوتی ہے۔ مشہور ہے کہ جو شخص اسے اپنے پاس رکھتا ہے اس پر لوگ مہربان ہو جاتے ہیں۔ یہاں خار راہ کو مہر گیا اس لئے کہا کہ خار سے پیر زخمی ہوا اور پائے فگار پر محبوب کو رحم آیا۔

اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

ہم لوگ کہ ہوا سے آگ مراد لیتے ہیں۔ بھلا ہم دل کے شرر سے کیا گھبرائیں گے۔

دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ!
اس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبؔ آشفتہ نوا کہتے ہیں

شیفتہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ شاگرد مومنؔ، وحشت غلام علیخاں وحشت شاگرد مومنؔ۔

○

آبرو کیا خاک اس گل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

جو گریبان (بہ علت چاک گریبانی لٹک کر) دامن میں نہ ہو وہ ننگ پیرہن ہے اور اس گل کے مانند ہے جو گلشن میں نہ ہو گویا کہ مذہب عشق میں گریبان کی اصلی اور مناسب جگہ چاک ہو کر دامن ہی کے پاس قرار پائی

ضعف سے اے گریہ! کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

روزن دیوار سے آفتاب کی جو شعاعیں مکان یار میں آتی ہیں ان کی روشنی میں جو بہت سے ذرے نظر آتے ہیں ان کی نسبت کہتا ہے کہ گویا اجزا ہیں نگاہ آفتاب کے جو روئے یار کی زیارت

کے مشتاق ہیں۔

کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں
رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں
زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

یعنی ہمارا زخم کا سلوانا بہ غرض چارہ جوئی نہیں ہے بلکہ اس لئے ہے کہ ہمیں زخم سوزن کی لذت حاصل ہو۔

بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں
قطرہ قطرہ ایک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا
خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں
لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

ساقی شراب پلانے میں بڑی فیاضی سے کام لیتا تھا اور اس پر مغرور تھا لیکن میں ایسا قلزم آشام تھا کہ میری بلانوشی نے ساقی کی نخوت مٹادی اور شیشہ کی سب شراب ختم ہوگئی۔ گردن مینا میں موج مے کی رگ نخوت کی رعایت سے لایا ہے کیونکہ رگ گردن کو غرور سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود!
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

یعنی ضعف چاروں طرف سے قد پر مستولی ہے پھر قد کیونکر اور کدھر جھکے ضعف کے مضمون میں اکثر شعرا نے نہایت نازک اور لطیف مبالغہ آمیز مضامین سے کام لیا ہے۔ مومن کہتا ہے ۔

اب تو مر جانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو
ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اُٹھا جائے ہے

ایک اور فارسی شاعر کہتا ہے ۔

زضعفِ تن عجب حال ست بیمارِ محبت را
کہ نتو اندکشید از ناتوانی بارِ صحت را

تھی وطن میں شان کیا غالب! کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

○

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آ سکا
گر اک ادا ہو تو اسے اپنی قضا کہوں

یعنی اگر صرف ایک ادا ہو تو میں اسے اپنی قضا کہوں (یعنی اس طور پر اس کی مدح کروں لیکن یہاں تو ہزاروں ادائیں ہیں۔ ادا اور قضا میں رعایت لفظی ہے۔

حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بسوے دل
ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں

حلقے یعنی زلف کے حلقے ہو چشمہائے کشادہ سے مشابہ ہیں اور تارہائے زلف گویا آنکھوں کی سرمہ سا نگاہیں ہیں۔

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں
ظالم! مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے! خدا نکردہ تجھے بے وفا کہوں

مجھ کو میرے گمان سے شرمندہ نہ کر بھلا میں اور تجھ کو بے وفا خیال کروں۔

◆

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے، چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے؟
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں
زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستم گر! ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں؟

◆

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن
غرۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

عالم امکان یعنی دنیا "غرہ اوج بنائے عالم امکان نہ ہو" کیونکہ ایک روز عالم امکان یعنی دنیا کا بھی فنا ہونا یقینی ہے۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل! غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائیگا یہ سازِ ہستی ایک دن

ڈھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ! پیش دستی ایک دن

○

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

یعنی ان کی جفائیں صرف چھیڑنے کے لیے ہیں۔ امتحان وفا کی غرض سے نہیں ہیں کیونکہ ہماری وفاداری پر ان کو اس قدر اعتماد ہے کہ ہماری نسبت وہ ترک وفا کا گمان نہیں کر سکتے۔

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا!
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

لطف خاص یعنی پرسش پنہاں جو گفتگو سے مستغنی ہو یعنی جو انداز و اشارات سے ادا ہو۔

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

ہم کو ستم عزیز ہے اور وہ ستم کرتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ وہ ہم کو عزیز رکھتا ہے کیونکہ ہم کو وہی چیز دیتا ہے جس کو ہم عزیز رکھتے ہیں۔

بوسہ نہیں، نہ دیجیے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے
ہر چند پشتِ گرمیِ تاب و تواں نہیں

ہر چند اس کا قہر جاں گداز ہے۔ اور ہم میں طاقت برداشت نہیں۔ اس پر بھی ہم اس کے قہر سے پناہ نہیں مانگتے۔ بلکہ عتاب مزید کے خواہاں ہیں۔

جاں مطربِ ترانۂ ہل من مزید ہے
لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں
خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں
ہے ننگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آزر فشاں نہیں
نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں
کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں؟
گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں
پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

روح القدس یعنی حضرت جبرئیل۔ اگرچہ وہ میرے برابر فصیح نہیں ہیں (معاذ اللہ) تاہم ”پاتا ہوں اس سے الخ“

جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

دلے کیوں کہے ابھی یعنی ابھی نہ کہے گا۔ نیم جان ہونے کی حالت میں کہے تو کہے جب یہ بہانہ ہو سکے گا۔۔ بہائے بوسہ جاں ہے نہ کہ نیم جاں۔

◆

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مزے پانو میں زنجیر نہیں

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھکو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

''جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں'' یعنی معدوم ہے جس طرح دیدہ تصویر کی نگاہ معدوم ہوتی ہے۔ یا یہ کہ شوق مجھ کو اس دشت میں لئے جاتا ہے۔ جہاں ہر شخص مثل تصویر محو حیرت ہو جاتا ہے۔

حسرتِ لذت آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہِ وفا جُز دمِ شمشیر نہیں

افسوس کرتا ہے کہ جادۂ راہ وفا جز دم شمشیر نہیں'' کیونکہ شمشیر دم بھر میں خاتمہ کر دیتی ہے۔ اور لذت آزار کی حسرت رہ جاتی ہے۔

رنجِ نومیدی جاوید! گوارا رہیو
خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

میرا نالہ تاثیر کا احسان لینے کی ذلت نہیں پسند کرتا ''رنج نومید جاوید'' ہی گوارا ہے تو خوب ہے۔

سر کھجاتا ہے جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے
لذتِ سنگ بہ اندازۂ تقریر نہیں

''بہ اندازہ تقریر نہیں'' یعنی بیان سے باہر ہے یا بیان نہیں ہو سکتی۔

جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجُز خجلتِ تقصیر نہیں

خجلت تقصیر یعنی ارتکاب قصور سے جھکنا۔ جب کرم یار گستاخی کی اجازت دے اس وقت جھجلنا بہت بڑا قصور ہے۔

غالبؔ! اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں''

○

مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع سویداے دلِ چشم میں آہیں

پتلی کو آنکھ کے دل کا سویدا قرار دیا۔ اور نگاہوں کو اس دل کی آہوں سے مشابہ کیا۔

○

برشکالِ گریۂ عاشق ہے دیکھا چاہیے
کھل گئی مانندِ گل سُو جا سے دیوارِ چمن
الفتِ گل سے غلط ہے دعویِٔ وارستگی
سرو ہے باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن

○

عشق تاثیر سے نومید نہیں
جاں سپاری شجرِ بید نہیں

کہتا ہے کہ عشق تاثیر سے ناامید نہیں ہے۔ کیونکہ جان بازی و جاں سپاری کچھ شجرِ بید نہیں ہے جس کا کبھی پھل نہ ملے گا۔ مطلب یہ ہے کہ عشق میں جانبازی و جانفشانی کا اثر کبھی نہ کبھی ضرور ہوگا۔

سلطنت دست بدست آئی ہے
جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

سلطنت دست بہ دست آتی ہے ''یعنی جام کی سلطنت جمشید سے رندوں کو واسطہ بہ واسطہ پہنچی ہے'' جام مے خاتم جمشید نہیں'' جو صرف جمشید کے پاس رہے اور اسی کے ساتھ مخصوص ہو۔

ہے تجلی تری سامانِ وجود
ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

جس طرح ذرے میں پرتو خورشید نظر آتا ہے۔ اسی طرح تمام موجودات عالم تیری ذات کے مظہر ہیں۔

راز معشوق نہ رسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومیِ جاوید نہیں

ہم کو محرومی جاوید کا غم نہیں ہے۔ کیونکہ یہ طرب سے بہتر ہے جس میں گردش رنگ کا خوف لگا رہتا ہے۔ یعنی چونکہ راحت کے بعد رنج نہایت جاں گداز ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے طرب سے محرومی جاوید ہی بہتر ہے۔

یا یہ کہ گردش رنگ طرب سے اس لئے ڈر ہے کہ محرومی کی حالت میں طرب کی جھلک سے رنج محرومی کا احساس اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

○

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

خیاباں خیاباں بہ معنی کثرت

دل آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے
سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں
ترے سروقامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

اس کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تیرے سروقامت سے فتنہ قیامت کمتر ہے۔ اور دوسرے یہ

معنی بھی ہیں کہ تیرا قد اسی میں سے بنوایا گیا ہے۔ اس لئے وہ ایک قد آدم کم ہو گیا ہے (یادگار غالب) یا یہ کہ فتنہ قیامت و فتنہ قامت دونوں موجود فی التصور ہیں۔ اور اس لحاظ سے برابر ہیں۔ لیکن باعتبار وجود ظاہری سرو قیامت یار نے فتنہ قیامت بہ قدر یک قد آدم کم ہے۔

تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری!
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

تماشہ کر۔ ترجمہ تماشا کن۔ یعنی دیکھ۔ دیوان غالب کے قدیم نسخے میں ”تماشا کہ“ لکھا ہے۔ اس حالت میں بھی محاورہ فارسی کی روح سے ”تماشا“ سے ”تماشا کر“ ہی کا مفہوم پیدا ہوگا۔

سُراغِ تُفِ نالہ لے داغِ دل سے
کہ شب رو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

نالۂ دل کو شب رو یا مسافر شب قرار دیا۔ اور داغ دل کو اس کا نقش قدم۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب!
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

○

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

آگ چونکہ (باعتبار افروختگی) خوئے یار سے مشابہ ہے۔ اس لیے صرف اس تشابہ کی وجہ سے مجھ کو عذاب نار میں راحت ملتی ہے۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

شبہائے ہجر کی درازی کا ذکر کرتا ہے۔ کہ اگر ان کو بھی حساب میں رکھوں تو معلوم نہیں۔ میرا زمانہ حیات کس قدر طویل ثابت ہو۔

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

''میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں'' کہ وہ کچھ نہ لکھیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان کی جانب سے کسی تحریر کے آنے کی امید ہوتی تو دوسرے خط کے لکھنے کے لئے اس کا انتظار کیا جاتا۔ لیکن چونکہ مجھ کو خوب معلوم ہے کہ وہ کچھ نہ لکھیں گے۔ اس لئے جواب خط کا انتظار بیکار ہے۔ ''قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں''

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام!
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

جو منکر وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

مطلب یہ ہے کہ محبوب دشمن وفا ہے اس پر کسی کا فریب محبت تو نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میری بدگمانی فضول ہے کہ کہیں اس پر دشمن یعنی رقیب کا فریب نہ چل گیا ہو۔

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں!

وصل میں مجھ کو رقیب کے آجانے کا کھٹکا لگا ہوا ہے۔ یہی سبب میرے اضطراب کا ہے۔ مگر تم کو یہ وہم ہے کہ میں کسی دوسرے محبوب سے چھپ کر آیا ہوں۔ اسی لئے مضطرب ہوں۔

میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

بعض نسخوں میں پہلا مصرعہ یوں ہے "تیوری چڑھی ہوئی ہے جو اندر نقاب کے" لیکن مرزا کے وقت کے معتبر نسخے میں "ہے تیوری الخ" ہے۔

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں
وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں
غالب! چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روز ابر و شبِ ماہ تاب میں

○

کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رُباب میں

تعجب کرتا ہے کہ وہ آواز تو جان بخش ہے۔ پھر اس کا یہ اثر کیسا ہے۔

رو میں ہے رخشِ عمر! کہاں، دیکھیے، تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

غیر سے یہاں ماسوا اللہ مراد ہے۔ جو صوفیہ کے نزدیک معدوم ہے۔ کیونکہ وہ وجود واجب کے سوا سب کو معدوم سمجھتے ہیں۔ کہتا ہے جس قدر ماسوا کے وہم سے رات دن پیچ و تاب میں رہتا ہوں۔ اتنا ہی مجھے اپنی حقیقت و معنی وجود واجب سے بعد ہے۔ (یادگار غالب)

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

کیونکہ مشاہدہ شاہد مشہود کے وجود کو علیحدہ علیحدہ چاہتا ہے۔

ہے مشتمل نمود صُوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

ان کا حجاب میں رہنا ہی ان کی بے حجابی پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ پردے میں رہ کر وہ اپنے سے نہیں شرماتے۔ حالانکہ شرم جو ایک ادائے ناز ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ خود اپنی ذات سے بھی حیا آئے یا یہ مطلب ہوگا کہ ان کا حجاب کرنا بھی ایک طرح کی بے حجابی ہے۔

چھپے جو مجھ سے تو کیا یہ بھی ایک ادا نہ ہوئی
وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری
(حسرت موہانی)

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

سالک کو تمام موجودات عالم میں حق ہی حق نظر آئے۔ اس کو شہود کہتے ہیں۔ اور غیب الغیب سے مراد مرتبۂ احدیت ذات ہے۔ جو عقل و ادراک اور بصر و بصیرت سے وراء الورا ہے۔ کہتا ہے جس کو ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں۔ وہ درحقیقت غیب الغیب ہے اور اس کو غلطی سے شہود سمجھتے ہیں۔ ہماری ایسی مثال ہے۔ جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں۔ پس گو وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے۔ مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب ہی میں ہے۔ (یادگار غالب)

غالبؔ! ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں، بندگیِ بوتراب میں

خدا کو دوست اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ندیم دوست قرار دیا ہے۔

○

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش! جانتا نہ تری رہگزر کو میں

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے

کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں؟
پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں
اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں

یعنی اہل دہر متاع ہنر کے قدر دان نہیں ہیں اور میں جو اپنے اوپر قیاس کر کے اہل دنیا کو متاع ہنر کا قدر دان سمجھ رہا ہوں یہ غلطی ہے۔

غالبؔ! خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

○

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

غیر ''ذکر میرا بہ بدی'' کر رہا ہے حالانکہ یار کو برائی کے ساتھ بھی میرا ذکر سننا منظور نہیں ہے اس لئے غیر کی بات'' الخ

وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق!
مژدۂ قتل مقدر ہے، جو مذکور نہیں
شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پُر ہمیں منظور نہیں

غالب دنیا کے موہوم ہونے کو بہ غلو بیان کرتا ہے کہتا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ عالم شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے اور ان سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ جس طرح شاہد کی کمر نہیں ہوتی۔ اس طرح سے وجود عالم بھی موہوم ہے لیکن ہم کو یہ منظور نہیں ہے کیونکہ جب کہتے ہیں کہ "عالم شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے" تو اگرچہ اس کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ عالم معدوم ہے لیکن "ہے" کا لفظ ہم ایسی شے معدوم کے لئے کسی طرح نہیں استعمال کر سکتے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں
حسرت! اے ذوقِ خرابی، کہ وہ طاقت نہ رہی
عشقِ پُر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں۔

شورش ہنگامہ عشق کے لئے قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن تن رنجور میں چونکہ ذرا بھی طاقت نہیں باقی ہے۔ اس لئے ذوق خرابی کو مخاطب کر کے اظہار حسرت کرتا ہے۔

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لینگے قیامت میں تمھیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ، ہم حور نہیں
ظلم کر ظلم اگر لطفِ دریغ آتا ہو
تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

یعنی اگر تو لطف نہیں کرتا۔ تو ظلم ہی کر، بہرحال تغافل نہ کر۔ "تغافل میں کسی رنگ سی معذور نہیں"، کسی رنگ سے یعنی تیرا شیوۂ ستم سے تغافل بھی ہم کو پسند نہیں ہے۔

صاف دردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں
ہوں ظہوریؔ کے مقابل میں خفائیؔ غالبؔ
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

○

نالہ جُز حسنِ طلب اے ستم ایجاد! نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

نالے کی نسبت کہتا ہے کہ اس سے بیداد یار کی شکایت منظور نہیں ہے۔ بلکہ تقاضائے جفا کے لئے حسن طلب ہے کہ وہ میری فریاد سنے تو اسے مجھ پر ظلم کرنا پھر یاد آ جائے۔

عشق و مزدورئ عشرتگہِ خسرو کیا خوب!
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں
کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں
وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا!
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

ہم اپنی خوئے تسلیم و وفا کے سبب سے فریاد نہیں کرتے لیکن وہ یہی سمجھتا ہے کہ ہماری خاموشی بیطاقتی و مجبوری کے باعث سے ہے پس وائے بہر حال تسلیم و وفا جو اپنی ضبط فریاد کی داد سے بھی محروم ہیں۔

رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے؟
گر چراغانِ سرِ رہ گزرِ باد نہیں

اگر گل و لالہ "چراغانِ سرِ رہگزر یاد نہیں" تو ان کا رنگ تمکین پریشان کیوں ہے کہ دم بھر میں مٹ جاتا ہے۔

سبدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
مژدہ اے مرغ! کہ گلزار میں صیاد نہیں

"مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں" جو مرغ کو قفس میں بند کر دیگا۔

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا
دی ہے جائے دہن اس کو دمِ ایجاد نہیں

وہ بات پر "نہیں" کرتا ہے لیکن اس نہیں کے کہنے سے اس کے وجود دہن کا ثبوت ملتا ہے۔

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں
کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ!
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں؟

○

دونو جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟
کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم؟

ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کریں؟

○

ہو گئی ہے، غیر کی شیریں بیانی، کارگر
عشق کا اس کو گماں ہم بیزبانوں پرنہیں

○

قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا: یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں
دلِ نازک پہ اس کے رحم آتا ہے مجھے غالب
نہ کر سرگرم اس کافر کو الفت آزمانے میں

○

دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی داد یاں
ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزار باد یاں

زوال آمادہ، آمادۂ زوال۔ مہر گردوں مثال چراغ رہگزر باد ہے۔ یعنی آمادۂ زوال ہے۔

○

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے!
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں؟

ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں!
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

اوجِ طالعِ لعل و گہر۔ کیونکہ تیری کلاہ میں لگے ہوئے ہیں۔

* * *

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

اس شعر کی ترکیب لفظی خوب ہے۔ کہتا ہے کہ قیامت کا مجھے اعتقاد ہے لیکن ساتھ ہی اس کے یہ بھی یقین ہے کہ وہ شب فراق سے زیادہ نہیں ہے۔

کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں
جو آؤں سامنے ان کے تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں
کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

یعنی مجھ کو وہ فتنہ و فساد سے تعبیر کرتے ہیں۔

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں
جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام؟
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں
تم انکے وعدے کا ذکر اُنسے کیوں کرو غالبؔ!
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

○

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے!
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

ہم جو آہ کرتے ہیں یہ گویا اپنی ہوا باندھتے ہیں ورنہ اثر آہ کی حقیقت معلوم ہے۔

تیری فرصت کے مقابل اے عمر!
برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

قیدِ ہستی سے رہائی معلوم
اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں

"باندھتے ہیں" یعنی شعرا مضمون شعر میں۔ چونکہ باندھنے کے معنی قید کرنے کے بھی ہیں اس لئے ایک پرلطف مضمون پیدا ہو گیا ہے۔

نشۂ رنگ سے ہے واشُدِ گل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

مصرعۂ ثانی مصرعۂ اول کی توضیح کرتا ہے یعنی پھول کی واشد (کھلنا) نشۂ رنگ کی مستی کی وجہ سے ہے۔ مستی کے اثر سے اس نے اپنے بندِ قبا کھول دیئے ہیں۔۱۲

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں!
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

سادہ پُرکار ہیں خُوباں غالبؔ!
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

یعنی ظاہر میں اظہارِ وفا کرتے ہیں۔ مگر دل میں فریب ہے۔

○

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

○

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

"دائم پڑا ہوا الخ" یعنی مثل تیرے سنگ در کے۔

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل؟
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں
کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؟
لعل و زمرّد و زر و گوہر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ؟
رتبہ میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منع قدمبوس کس لیے؟
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں؟

غالبؔ! وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

○

سب کہاں! کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں، کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں، ہم کو بھی، رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

"نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں" یعنی فراموش ہو گئیں اس شعر کے الفاظ نہایت لطیف و رنگین ہیں اور یہ پوری غزل ریختے کا عالی درجہ کا نمونہ ہے۔

تھیں بنات النعشِ گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

قید میں یعقوبؑ نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

کیونکہ زنان مصر نے اس کی پسند کی مطابقت کی اور خود بھی محو حسن یوسفی ہو کر زلیخا کے عشق حضرت یوسفؑ میں معذور رکھا۔

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ، شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پریزادوں سے لینگے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب! دل کے پار؟
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

''جو مژگان ہوگئیں'' یعنی کوتاہ ہوگئیں اور شرم کی وجہ سے میری جانب بے محابا نہیں اٹھتیں غالب کہتا ہے کہ اس کوتاہی پر بھی وہ نگاہیں کیوں میرے دل کے پار ہوئی جاتی ہیں۔

بس کہ روکا میں نے اور سینہ میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں، تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں، صرفِ درباں ہو گئیں

اس شعر میں جو اصل خوبی و لطافت ہے وہ یہ ہے کہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دینے کو ایک ایسی معمولی اور ضروری بات ہونا ظاہر کرتا ہے کہ گویا ہر شخص اس کو ضروری جانتا ہے۔ کیونکہ سب سے حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ بتاؤ ان کی گالیوں کا کیا جواب دوں گا۔ جبکہ دعائیں سب نبڑ چکیں۔

(یادگارِ غالب)

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم مُوحِّد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

جب ترکِ رسوم مذہب قرار پایا تو جتنی ملتیں مٹتی جاتی ہیں وہ گویا اجزائے ایماں بنتی جاتی ہیں۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں
یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

○

دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں
دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں
ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

تحصیل دشوار آسان نہیں ہوتی مگر ممکن ہوتی ہے۔ اور تحصیل محال سرے سے ممکن ہی نہیں ہوتی شاعر کہتا ہے کہ ملنا تیرا آسان نہ ہو یعنی دشوار ہوتا تاہم سہل ہے مگر مشکل تو یہ ہے کہ دشوار بھی نہیں محال ہے جس میں میرا کسی طرح قابو نہیں محض مجبور ہوں۔ یا کہ تیرا ملنا اگر سب کے لئے مشکل ہو تو مجھ کو بھی صبر آ جائے۔ مشکل یہ ہے کہ اغیار کے لئے آسان ہے میری ہی لئے دشوار ہے۔

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں
شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا! کوئی دیوار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیار یک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

ڈر نالہ ہائے زار سے میرے خدا کو مان
آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے رُوکشی
حال آنکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

رُوکشی مقابلہ۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

○

نہیں ہے زخم کوئی بخیہ کے دُرخور مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتۂ چشمِ سوزن میں

رشتۂ سوزن کو تارِ اشکِ یاس کہا۔ سوزن کو یاس لئے ہوئی کہ کوئی زخم بخیے کے قابل نہ نظر آیا۔

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

ودیعت خانۂ بیدادِ کاوشہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرے ہر قطرہ خوں تن میں

ہر قطرۂ خون نگیں ہے جس پر معشوق کا نام کھدا ہوا ہے اور میں گویا ودیعت خانۂ بیداد کاوشہائے مژگاں ہوں۔

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی!
شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

نکوہش، مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

نکوہش میرے شورِ جنوں کی بے ربطی سے مانع آئی یعنی خندہ احباب کے خیال سے میں جب دامن کے چاک کرنے سے باز رہا۔ پس گویا خندہ احباب بخیہ جیب و دامن ٹھہرا۔

ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پُر افشاں جوہر آئینے میں مثلِ ذرّہ روزن میں

تمثال یعنی شبیہ صورت۔ پُر افشاں ہوئے جس طرح ذرے روزن میں۔

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

ہزاروں دل دیے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

یعنی محبوب کے لطف و عنایت نے مجھ کو گرفتار محبت کر رکھا ہے۔

اسدؔ! زندانیِ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہوں
خمِ دست نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

○

مژے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں

مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں
یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے!
کہ غیر جلوۂ گل رہگزر میں خاک نہیں
بھلا اسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

"مجھی کو رحم آتا" یعنی اپنی حالت پر رحم آتا اور میں نالہ کشی سے باز آتا۔

خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں مے کش
شراب خانہ کے دیوار و در میں خاک نہیں
ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں
ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد!
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

* * *

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں؟
روئینگے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں؟
دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم، غیر ہمیں اٹھائے کیوں؟
جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیمروز

آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں؟

جمالِ نظارہ سوز وہ حسن جس کا نظارہ نہ ہو سکے۔

دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں؟
قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟
حُسن اور اس پہ حسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں؟

رہ گئی بوالہوس کی شرم کیونکہ اگر محبوب کو اپنی عفت پر اعتماد اور غیر کی نسبت حسن ظن نہ ہوتا اور وہ غیر کا امتحان کرتا تو ساری حقیقت کھل جاتی۔

واں وہ غرورِ عز و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں؟
ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بیوفا سہی
جسکو ہو دین و دل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں؟
غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں!
روئیے زار زار کیا؟ کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

○

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

پرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے
اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

رات کے وقت مے پیے، ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھیے
سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

بزم میں اس کے رو برو کیوں نہ خموش بیٹھیے!
اس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ "یوں"

اس کی خاموشی کا بھی یہی مطلب ہے کہ تو بھی خموش بیٹھ۔

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

یہ شعر لفظ ستم ظریف کے مفہوم کی تشریح کرتا ہے۔

مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی!
آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

حیرت نقش پا نے مجھ کو کوئے یار میں رہنے کی وضع بتا دی یعنی اپنی افتادگی و حیرانی کی مثال دیکر۔

گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

وصل سے شوق کم ہو جاتا ہے۔ دیکھ موج بحر بھی یہی بات بزبان حال کہہ رہی ہے موج کی حرکت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ وصل بحر سے علیحدہ ہو کر کنارے پر پہنچنے کے لئے دست و پا مار رہی ہے۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

ردیف ''واؤ''

حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ، شاید، کثرتِ نظّارہ سے وا ہو

انسان کے دل میں حسد کا مادہ اسی وقت تک زیادہ جوش زن رہتا ہے جب تک کہ اس کی نظر وسیع نہیں ہوتی۔ اس بنا پر حسد اور افسردگی دل کا علاج یہ بتایا ہے کہ گرم تماشا ہو کر وسعت نظر حاصل کرے۔

بقدرِ حسرتِ دل چاہیے ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

بھروں یعنی آلودہ کردن جب آبِ ہفت دریا سے دامن کا ایک گوشہ تر ہو تو کامل تردامنی کے لئے کیا کچھ درکار ہوگا۔

اگر وہ سروِ قد گرمِ خرامِ ناز آ جاوے
کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری، نالہ فرسا ہو

* * *

کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے!
ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو

غالبؔ! کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو
چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو
ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلا
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو
پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو

ہر درد کی دوا موجود ہے۔ غالب اس مقولے کے خلاف کہتا ہے کہ اگر یہ بالکل صحیح ہوتا تو لازم آتا ہے کہ غمِ الفت کا بھی علاج موجود ہو حالانکہ ایسا نہیں ہے اور دردِ عشق لا دوا ہے۔

ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو
ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

دوسروں کا اثر قبول کرنا اور احسان لینا زبونی ہمت کی دلیل ہے اس لئے دہر سے عبرت بھی حاصل نہ کرنا چاہیے۔

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

اگر تو نے ترک تعلقات کر کے آزادی حاصل کی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تو وارستگی کا عذر رکھ کر لوگوں سے وحشت کرنے لگے اور اگر کرتا ہی ہے تو اپنے سے وحشت کر نہ کہ دوسروں سے۔

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو
اس فتنہ خُو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسدؔ!
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

○

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا برا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو!

مرا ہونا برا کیا ہے الخ کیونکہ میں قفس میں ہوں اور لطف چمن میں ان کا حصہ دار نہیں بن سکتا۔

نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا! آرزوے دوست دشمن کو

یہ مانا کہ محبوب کے ساتھ رقیب کی ہمدمی آسان نہیں ہے لیکن میرے لئے یہی رشک کیا کم ہے کہ میں دوست کا آرزومند ہوں اور غیر بھی ہے۔

نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگانِ سوزن کو

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

''جاناں کے دامن'' اگرچہ صحیح ترجمہ ہے ''دامان جاناں'' کا لیکن فصیح نہیں ہے تعجب ہے کہ غالب نے اس کا استعمال جائز رکھا۔

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جُوئے خوں میں تیرے توسن کو

ہوا چرچا جو میرے پانو کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے!
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برقِ خرمن کو

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

بتخانے میں مرنا برہمن کی استواری عہد اور وفاداری کی دلیل ہے اور چونکہ یہی اصل ایمان ہے اس لئے اسے کعبے میں دفن کرنا چاہیے۔

شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خُو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا!
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے؟
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو؟
مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالبؔ!
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

○

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو
دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو
ہیہات! کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو
بھاگے تھے ہم بہت سو اُسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانو
مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانو
اللہ رے ذوقِ دشت نوردی! کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو
ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانو
شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں!
دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پانو

غالبؔ! مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

◆

واں اسکو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار
یعنی، یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو!
اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ
آئینہ تا کہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

تا کہ یعنی جب تک کہ (نثر) اس کا ذوق ستم تو دیکھئے کہ جب تک دیدۂ نخچیر کا آئینہ نہ ہو وہ اپنے کو نہیں دیکھتا یعنی اپنی صورت آئینہ دیدۂ نخچیر کے سوا اور کسی آئینے میں نہیں دیکھتا۔

◆

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صدرہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو

صدرہ یعنی سو بار۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا بہانہ زمین بوسی قدم ہے۔ اپنے قدموں کی اس درجہ عزت اس لحاظ سے مناسب ہے کہ انھیں کے ذریعہ سے کوچہ محبوب میں آنا ہوا۔

دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے
کس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہم ہے ہم کو!
ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن
تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو
رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگ حزیں
نالۂ مرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہم کو
جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

''جانکر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو'' کیونکہ جان کر تغافل کرنا بھی ایک قسم کا التفات پنہاں ہے۔

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو کہ تیرا سر ضرور اڑا دینگے۔ لطف مضمون اس شعر کا قابل غور ہے۔

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ ولیکن ناچار
پاسِ بے رونقیِ دیدہ اہم ہے ہم کو

''دل کے خوں کرنیکی کیا وجہ'' یہی کہ بغیر خونفشانی کے آنکھی بے رونق تھیں اور ہم کو یہ امر ناگوار تھا۔

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو
لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب!
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

○

تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو!

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

مواخذہ بمعنی پرسش۔ میرے قتل کی بابت بروز حشر تم سے پرسش ضرور ہوگی۔ یعنی اگر رقیب قاتل قرار پائیگا۔ اس وقت بھی تم سے بطور گواہ اس امر کی پرسش ضرور ہوگی۔ پس تم کسی طرح پرسش روز حشر سے نہیں بچ سکتے۔

کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق نا سپاس ہیں؟
مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

کسی کی یعنی کسی نظارگی کی۔ مرتا ہوں یعنی رشک و بدگمانی کے باعث۔

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو!

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو!

غالبؔ بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یارب اور مرا بادشاہ ہو!

○

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیوں کر ہو

"کہے سے" یعنی گفتگو ہونے پر بھی کچھ نہ ہوا۔

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو
ادب ہے اور یہی کش مکش تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گومگو تو کیوں کر ہو
تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خُو تو کیوں کر ہو
اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو
جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو
ہمیں پھر اُن سے امید اور انھیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیوں کر ہو
غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا
نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیوں کر ہو
بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار
یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیوں کر ہو
مجھے جنوں نہیں غالبؔ! ولے بقولِ حضور
فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہو

○

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو؟
نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو؟
وہ اپنی خُو نہ چھوڑینگے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں!
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو!
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو؟
وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل! تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟
قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم!
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟
یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو؟

تم مجھ سے یہ تو کہہ نہیں سکتے ہو کہ ہم تیرے دل میں نہیں ہیں لیکن یہ بتلاؤ جب میرے دل میں تمہیں تم ہو تو پھر تم میری نظروں سے یوں نہاں ہو پہلے مصرعہ میں استفہام انکاری ہے۔

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے!
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو؟
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے؟
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

یعنی تمہاری دوستی ہی کیا کم فتنہ ہے۔

یہی ہے آزمانا، تو ستانا کس کو کہتے ہیں!
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو؟

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

اس شعر کی ترکیب نہایت دلپذیر ہے۔ اور یہ پوری غزل حسن کلام اور لطف سخن کا نمونہ ہے۔

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب!
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو؟

○

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو بیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

ردیف "ہائے ہوز"

* * *

از مہر تا بہ ذرّہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

آفتاب سے لیکر ذرے تک ہر شے مانند دل ہے اور دل بصورت آئینہ ہے پس گویا طوطی کو ہر سمت سے آئینہ مقابل نظر آتا ہے یعنی آئینہ خانے کی طرح ہر طرف اپنی ہی شبیہ نظر آتی ہے۔

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

ہے سبزہ زار الخ ''یعنی بر بنائے گریہ۔ ویرانی بمصداق ''اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر''

ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے
دشواریِ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

ستم ہمرہاں اس لحاظ سے کہا کہ ان کی موجودگی کے باعث سے بیکسی کی بھی حسرت اٹھانا پڑتی ہے کیونکہ جب لوگ ہمراہ ہیں تو ہم اپنے کو بیکس بھی نہیں کہہ سکتے۔

ردیف "یائے تحتانی"

صد جلوہ رُو بہ رُو ہے جو مژگاں اٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے کیونکہ آنکھ اٹھاتے ہی سیکڑوں جلوہ ہائے یار پیش نظر جائیں گے جن کے دیکھنے کی ہم میں تاب نہیں ہے۔

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق
یعنی ہنوز منتِ طفلاں اٹھائیے

برات بمعنی اصطلاحی " کاغذ نوشتہ کو بموجب آں از خزانہ زر بدست آید۔" یعنی چونکہ نشانہ سنگ طفلاں ہونا لوازمات دیوانگی سے ہے اس لئے گویا جنون میں بھی منت کشی کا جھگڑا باقی رہا۔

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب! نہ احساں اٹھائیے

یا میرے زخم رشک کو رسوا نہ کیجیے
یا پردۂ تبسمِ پنہاں اٹھائیے

اگر آپ اپنے تبسم پنہاں کا پردہ نہیں اٹھاتے ہیں تو میرے زخم رشک کو بھی رسوا نہ کیجئے۔ کیونکہ غیر کے ساتھ آپ کے تبسم ہائے پنہاں کے ہوتے ہوئے میرا رشک بجا ہے۔

○

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

آنکھ کو خرابات اور ابرو کو طاق مسجد سے مشابہ کیا ہے۔ لیکن بھوں کا لفظ بہت ثقیل ہے۔

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

دے داد اے فلک! دلِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو؟
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

سر پائے خم پہ چاہیے ہنگامِ بیخودی
رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

خاموشی کو اصل اور تمام باتوں کو فروغ قرار دیا۔ "نکلے ہے جو بات چاہیے" ذومعنی فقرہ ہے

ایک تو یہ خاموشی سے ہر بات نکلتی ہے کیونکہ خاموشی کو فکر سے تعلق ہے اور اس لئے وہ اصل ہے تمام باتوں کی دوسرے یہ کہ جو بات چاہیے وہ خاموشی ہی سے نکلتی ہے یہاں بات نکلتی ہے" بمعنی محاورۂ مشہور لیا جائے گا۔ مثلاً کہتے ہیں کہ فلاں کی دیوانگی میں بھی ایک بات نکلتی ہے۔"

نشو و نما ہے اصل سے غالبؔ! فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

○

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی
رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

یعنی منجملہ اور تمناؤں کے (جو درجے میں تمنائے مرگ سے کہیں بڑھ کر ہیں) ایک خواہش مرگ بھی ہے پس ظاہر ہے کہ خیالِ مرگ سے دلِ آزردہ کو کیا تسکین ہو سکتی ہے۔

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم!
کہ ہو گا باعثِ افزایشِ دردِ دروں وہ بھی
نہ اتنا بُرشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی
مۓ عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالبؔ! شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

○

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

بتان خوشامد طلب سے ہم ایسے تنگ آئے ہیں کہ سخن لبوں سے آزردہ ہے یعنی بات کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

ہے دورِ قدح وجہِ پریشانیِ صہبا
یک بار لگا دو خُمِ مے میرے لبوں سے
رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد!
زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

طرف ہونا یعنی منہ لگنا۔ یہ پرانا محاورہ ہے جواب متروک ہے۔

بیداد وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر
ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

جاتی رہی یعنی جان جاتی رہی۔ اگرچہ اس کو لبوں سے بہت کچھ ربط تھا۔ مطلب یہ ہے کہ میری جان لبوں ہی پر رہا کرتی تھی اس لئے اس کو لبوں سے محبت ہوگئی تھی لیکن بیداد وفا نے آخر کار دونوں کو جدا کر دیا۔

○

تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

غالبؔ! ترا احوال سنا دینگے ہم ان کو
وہ سن کے بلا لیں یہ اجارا نہیں کرتے

○

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

فلک ستم گر مشہور ہے اور تو بھی جفا کار ہے۔ اس لئے آسمان کو دیکھ کر تو یاد آجاتا ہے۔

کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب!
قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

وہ میرے خط کو جلا دیا کرتا تھا اور اس طرح پر میرے سوزِ غم کا حال اس پر ظاہر ہو جاتا تھا افسوس کہ اب اس نے خط کا جلانا بھی موقوف کر دیا۔

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

لکد کوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ!
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

○

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی!
دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

"ڈوبی آسامی وہ کاشتکار جس سے لگان وصول ہونے کی امید نہ ہو۔ دل کو ڈوبی اسامی اس لئے کہا کہ سیلاب گریہ کے ہوتے کسی فائدے کی امید نہیں معلوم ہوتی۔

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

ہو داغ ناتمامی۔ یعنی اپنے نقص کی بنا پر داغ بدل ہوں۔

○

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مُور آسمان ہے

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرّہ میں جان ہے

حال آنکہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشہ پہ مے کا گمان ہے

میرا شیشہ لبریز شراب ہونے کے سبب سے سرخ نہیں ہے۔ بلکہ ضرب سنگ نے اسے زخمی کر دیا ہے۔

کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے!

اہل ہوس کا سینہ چونکہ آتش شوق سے خالی ہوتا ہے اس لئے اس کو ٹھنڈے مکان سے تعبیر کیا ہے

کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے

کشور ہندوستان کی فارسی ترکیب میں نون غالبؔ کے وقت تک جائز تھا اب ناجائز ہے۔

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

غم سے جو داغ پیدا ہوا تھا۔ وہ جگر کو کھا گیا اب کسی کو اس بات کا یقین نہیں آتا کہ یہ داغ اسی جگر کی نشانی ہے۔

ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر
غالبؔ! ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے

مضمون اس شعر کا خوب ہے لیکن مصرعہ ثانی میں ''وہ'' یا اس کے ہم معنی لفظ کے بغیر فصاحت نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ ہم تم سے بھی خوش ہیں۔ اس لئے کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس ہماری وفاداری پر اعتماد ہے اور وہ جانتا ہے کہ ہم کسی حال میں ترک محبت نہ کریں گے۔

* * *

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے!
کیا ہوئی ظالم! تری غفلت شعاری ہائے ہائے!

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے
کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال؟
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے!
عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا؟
عمر کو بھی تو نہیں ہے پایداری ہائے ہائے!
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے!

چونکہ زندگی نے تجھ سے وفا نہ کی اس لئے میں بھی تجھ سے بیزار ہوں۔ یہ پوری غزل مرثیہ محبوب ہے۔

گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا؟
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے!
شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے!
خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے!
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے!

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشکال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے!
گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے!
عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ! ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے!

○

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

مرنے چونکہ تسکین ہو جائے گی اس لئے امید مرگ پہ تسکین کو نوید دینا ہے۔

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے۔ حالانکہ حقیقت حال یہ ہے کہ میرا دل اس کے پاس ہے۔ میرے پاس نہیں یا یہ کہ میرے اختیار سے باہر ہو گیا ہے۔

کیجیے بیاں سرورِ تبِ غم کہاں تلک
ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے
ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا
ہرچند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے
پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

اس شعر میں شب مہتاب کے ساتھ بلغمی مزاج اس رعایت سے آیا ہے کہ بلغمی مزاج کی طرح

شبِ ماہ سرد ہوتی ہے اس لئے اس کا مزاج بھی مرطوب معلوم ہوتا ہے۔

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ!
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

○

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

اگر خاموشی سے یہی فائدہ ہے کہ اس سے اخفائے حال میں مدد ملتی ہے تو میں خوش ہوں کہ مجھے بغیر خاموشی کے وہی بات حاصل ہے کیونکہ کوئی میری بات سمجھ نہیں سکتا۔

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلا؟
دل فردِ جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے

زبان لال یعنی زبان گنگ ہزاروں حسرتیں ایسی تھیں جن کے اظہار کی حسرت دل کے دل ہی میں رہ گئی۔ پس گویا دل زبان ہائے لال کی فرد جمع و خرچ ہے یعنی شکووں کا ایک دفتر ہے۔

کس پردہ میں ہے آینہ پرداز اے خدا!
رحمت کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے

اے خدا! رحمت جو لب بے سوال کی عذر خواہ ہے کس پردہ میں آینہ پرداز ہے۔ یعنی جو لوگ راضی بر رضائے الٰہی ہیں ان پر رحمت کے نازل ہونے میں کیا دیر ہے۔

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی!
اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے؟

منفعل۔ یعنی ''شرمندہ'' شوق سے کہتا ہے کہ اپنے اس خیال پر شرمندہ ہو بھلا وہ اور دشمنی کرے گا۔ ظالم میرے گمان سے مجھے منفعل نہ پاہ (غالب) میں اور خدا نہ کردہ میں تجھے بے وفا کہوں۔

مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان
نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

لباسِ کعبہ کو علی کے قدم سے مشکیں جان۔ (ورنہ کعبہ) نافِ زمین ہے نہ کہ خوشبو نافِ غزال۔

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ!
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

خیال یعنی وہم۔

○

تم اپنے شکوہ کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

دلا! یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

آخر یعنی بعد چند روز کے نہ یہ گریۂ سحری ہی رہے نہ آہِ نیم شبی۔

○

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا
ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

گویا حرفِ وفا غلط تھا جو تیرے خط کے کاغذ سے خود بخود مٹ گیا۔

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں؟
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا ذوقِ فنا ناتمام یعنی ناقص ہے کیونکہ باوجود نفس کی آتش باری کے ہم

ایک بار جل کر فنا کیوں نہیں ہو جاتے۔

آگ سے، پانی میں بجھتے وقت، اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی، درماندگی میں، نالہ سے ناچار ہے
ہے وہی بدمستیِ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے
مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی، ان دنوں بیزار ہے
آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

○

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

○

مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

ظاہر ہے کہ مدت کے عالم میں انسان آہ و نالہ بھی بھول جاتا ہے اسی اعتبار سے اپنی ہستی و جدت آباد تمنا اور نالے کو اس عالم حسرت کا عنقا قرار دیتا ہے۔ جس سے مطلب یہ ہے کہ میری حسرت مانع فریاد ہے۔

خزاں کیا فصلِ گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم!
اثر فریاد دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے؟

نہ لائی شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

کف افسوس ملنا عہد تجدید تمنا ہے اس کا مضمون بہر صورت صحیح ہے یعنی بظاہر صورت اس طور پر کہ عہد باندھتے وقت بھی ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہیں اور یعنی اس طرح پر کہ کف افسوس ملنا ثبوت اس کا ہے کہ جس شے کا ہم افسوس کر رہے ہیں۔ اس کی تمنا بھی کر رہے ہیں اور اسی کا نام تجدید تمنا ہے۔

○

رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے
نبضِ بیمارِ وفا دُودِ چراغِ کشتہ ہے

یعنی آخری وقت میں تو رحم کر جبکہ میری حالت چراغ کشتہ کے مانند ہے اور میری نبض گویا اس کے دھویں سے ماند ہے۔ بود بمعنی ہستی' اصطلاح طب میں وقت آخری نبض کو دودی کہتے ہیں۔

دل لگی کی آرزو بےچین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی سودِ چراغِ کشتہ ہے

بیرونقی سود چراغ کشتہ ہے' کیونکہ جس وقت تک چراغ خاموش رہتا ہے اس وقت تک اس کا تیل نہیں صرف ہوتا۔ اس لئے بے رونقی ہی میں اس کا فائدہ ہے۔

○

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دُودِ شعلۂ آواز ہے

یار کی چشم سخن گو کی صفت بیان کرتا ہے کہ وہ بحالت خاموشی بھی ہوتی ہے۔ تو کہوے یا کہے تو

پرانا محاورہ ہے بمعنی گویا سخن گوئی چشم یار کے لحاظ سے سرمہ کو شعلہ آواز کا دھواں کہا۔

پیکرِ عشّاق سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ گویا گردشِ سیّارہ کی آواز ہے

سیارے سے یہاں سیارہ بد قسمتی مراد ہے۔ عاشقوں کے ہمہ تن نالہ و فریاد ہونے کے اعتبار سے جسم عشاق کو طالع ناساز کا ساز کہا ہے۔

دستگاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے

دستگاہ بمعنی قدرت و مرتبہ، یک بیاباں بمعنی کثرت یعنی دیدہ مجنوں کی خون باری سے زمین جو سرخ ہوگئی ہے تو گویا اس کا فرش پا انداز جلوہ گل سے بنا ہے اور یہ اس کی بلند پائیگی کا ثبوت ہے۔

○

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی؟
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

کیوں کہ میں پاک دامن ہوں۔

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے!
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اچھا اگر غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی، ہم کو بھی اپنے ساتھ کچھ دشمنی نہیں ہے۔ یہ تیرے اس قول

کے ہوتے ہوئے بھی دعویٰ محبت کیے جائیں اور تکلیف رشک برداشت کریں۔

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برقِ خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں!
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف!
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ!
گر نہیں وصل، تو حسرت ہی سہی

○

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

نکوہش بمعنی ملامت۔ یعنی وطن میں مجھ کو آرام حاصل ہے اس لئے صبح وطن (باعتبار اپنی سفیدی کے) گویا میرے لئے خندہ دنداں نما ہے اور میری آرام طلبی پر مجھ کو ملامت کر رہی ہے۔

ڈھونڈے ہے اس مُغنّیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

یعنی میں اس درجہ محوِ خیال ہو جانا چاہتا ہوں کہ پھر مجھکو ہوش میں آنے کی خواہش باقی نہ رہے۔

کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

چونکہ تو نکہت گل کی موجودگی میں باغ میں بے حجابیاں کرتا ہے اس لئے مجھ کو نکہت گل سے بھی حیا آنے لگی ہے۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ؟
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

○

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

○

اس بزم میں، مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

بیٹھا رہا یعنی بے ہمتی سے اگرچہ اغیار میری جانب ازراہ تمسخر و طعن اشارے کرتے رہے۔

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجّادہ رہنِ مے
مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے
بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے
مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم!
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے؟
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خُو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
ضد کی ہے اور بات مگر خُو بری نہیں
بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

خو یعنی سہو کی خو جس کی بنا پر اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے۔ یا یہ کہ اس کی دوسری بات ہے کہ وہ خدا سے وعدہ وفا نہ کرے لیکن اس کی عادت بری نہیں ہے یعنی یہ کہ جب وہ اپنی ضد کو بھول جاتا ہے تو سیکڑوں وعدے وفا کرتا ہے۔

غالبؔ! تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا؟
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

○

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

قاعدہ ہے کہ سال کا حساب گردشِ آفتاب سے کیا جاتا ہے لیکن غالب کہتا ہے کہ عمرِ گریزاں

کے سال کا حساب برق سے کیا جاتا ہے گویا اس کے سال کی مقدار ایک چشمک برق کے برابر ہے۔

مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے
بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے
زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے
جاداد بادہ نوشیِ رنداں ہے شش جہت
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

جاداد بمعنی جائیداد، گیتی خراب بمعنی رسوائے زمانہ مطلب یہ ہے کہ غافل یہ خیال کرتا ہے کہ رندان بادہ نوش رسوائے زمانہ ہیں۔ حالانکہ تمام عالم ان کی بادہ نوشی کی جائیداد ہے یعنی بصورت بے پروائی و فارغ البالی۔

نظّارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا
جوشِ بہارِ جلوہ کو جس کے نقاب ہے

جس برق حسن کا یہ عالم ہو کہ جوش بہار اس کے جلوے کیلئے نقاب کے مانند ہو اس کے نظارے کی کون تاب لاسکتا ہے۔

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں؟
مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے
گزرا اسد! مسرتِ پیغامِ یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

○

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے!

اپنے انتہائے رشک کو بیان کرتا ہے کہ مجھے یہ بھی گوارا نہیں ہے کہ خود میں اسے دیکھوں۔

ہاتھ دھولوں دل سے بھی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

گرمی اندیشہ کو تندی صہبا سے اور آبگینہ سے مشابہ کیا ہے۔

غیر کو یارب! وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے؟
گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

گر حیا بھی اس کو آتی ہے یعنی غیر کی گستاخی اور خواہش بے جا ہے تو شرما جائے ہے یعنی غیر سے یا اس کے ساتھ تکرار کرنے سے (یادگار غالب)

شوق کو یہ لَت کہ ہر دم نالہ کھینچے جایئے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

دور چشمِ بد تری بزمِ طرب سے واہ واہ!
نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

نالہ نغمہ ہو جاتا ہے یعنی تیری بزم طرب کی تاثیر ہے۔

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

عرض تغافل یعنی طرز تغافل عاشق جو اخفائے عشق کی غرض سے برتا جائے ہے شاعر کہتا ہے کہ اگرچہ ہم محبوب کے سامنے اسی طور سے رہتے ہیں کہ اس سے بے تعلق معلوم ہوں لیکن ہماری از خود رفتگی سے اس پر سارا حال دل ظاہر ہو جاتا ہے۔

اس کی بزم آرائیاں سن کر دلِ رنجور یاں!
مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

بیٹھنے کا تعلق دو لفظوں سے ہے یعنی ایک تو بیٹھنا نقش مدعائے غیر کا یعنی بر آنا مدعائے رقیب کا دوسرے بیٹھنا دل عاشق کا بے طاقتی و مایوسی کے سبب سے۔

ہو کے عاشق، وہ پری رُخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہیں
نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں!
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

اس کی تصویر مصور سے بھی ناز کرتی ہے کہ جس قدر اسے کھینچتا ہے اسی قدر وہ اس سے اکڑ جاتی ہے۔

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دُود بھاگے ہے اسد!
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے؟

○

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

گرمیٔ فریاد کے باعث سے شبہائے ہجر کی سردی سے مجھ کو اماں ملی۔

نسیہ ونقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم!
لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے

میری ہمت عالی نے مجھ کو مجھے لے لیا یعنی میری ہمت عالی نے یہ گوارا نہ کیا میں نقد دنیا یا عقبیٰ کے عوض بک جاؤں جن کی مقدار بے حقیقت اور میری خریداری کے لئے ناکافی ہے۔

کثرت آرائیِ وحدت ہے پرستاریِ وہم
کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے
ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا!
عجب آرام دیا بے پرو بالی نے مجھے

◆

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے

دہقان کی سعی گل کے حق میں اس کے۔ یعنی گل کے خرمن راحت کیلئے برق کا کام دیتی ہے۔ دیکھو وہ لالہ کے درخت پر اس قدر کوشش کرتا ہے لیکن اس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ گل لالہ داغ بدل ہو جاتا ہے۔

غنچہ تا شگفتن ہا برگِ عافیت معلوم
باوجود دلجمعی خوابِ گل پریشاں ہے

تا شگفتہ ہا یعنی کھلنے کے وقت تک برگ بمعنی ساز سامان۔ معلوم بمعنی معدوم خواب گل پریشاں ہے۔ کنایہ اس امر کی جانب ہے کہ اس کی پنکھڑیوں میں بکھر جانے کا مادہ پنہاں ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ کھلنے کے وقت تک غنچہ کے لیے یہ آرام باقی رہنا ناممکن ہے کیونکہ ظاہر میں اگرچہ اس کی منوری صورت سے اس کی دل جمعی کا خیال ہوتا ہے لیکن حقیقت میں اس کی پنکھڑیوں پر پریشانی مادہ پنہاں ہوتا ہے۔

ہم سے رنجِ بیتابی کس طرح اٹھایا جائے!
داغ پشتِ دستِ عجز شعلہ خس بدنداں ہے

جب داغ اور شعلہ بزبان حال اظہار عجز کر رہے ہیں اور بے تابی کی تکلیف برداشت کر نہیں سکتے تو بھلا ہم سے رنج بیتابی کیونکر اٹھے گا۔ شعلہ کا خس بہ دنداں ہونا اور داغ کی مشابہت پشت از دست سے ظاہر ہے!!

◆

اُگ رہا ہے درودیوار سے سبزہ غالبؔ!
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

سادگی پر اس کی، مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

ہمارے دل میں اس کی سادگی میں مر جانے کی حسرت ہے لیکن پھر بس نہیں چلتا کیونکہ اس کے ہاتھ میں خنجر ہے اس لئے بجبوری کشتۂ خنجر ہونا پڑے گا۔ یا یہ کہ اس کی سادہ لوحی پر مر جانے کی حسرت ہے جو ہم کو خنجر سے مارنا چاہتا ہے اور نہیں جانتا کہ ہمیں بے خنجر ہی شہید کر سکتا ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کسی کے حسن بیاں کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ جو بات قاتل کے منہ سے نکلے وہ سامع کے دل میں اس طرح اتر جائے کہ اس کو شبہ ہو کہ یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی۔ (یادگار غالب)

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

بس ہجومِ نا امیدی! خاک میں مل جائیگی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

ہم جانتے ہیں کہ ہماری سعی بیکار ہے لیکن پھر بھی اس میں ایک قسم کی لذت ملتی ہے پس اے ہجوم ناامیدی بس کر کہ کہیں تیری وجہ سے یہ لذت بھی خاک میں نہ مل جائے۔

رنجِ رہ کیوں کھینچیے؟ واماندگی کو عشق ہے
اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

ہم کو چونکہ واماندگی سے ایک قسم کا عاشقانہ تعلق ہے اس لئے ہمارا جو قدم اٹھ نہیں سکتا (یعنی جو واماندہ ہے) وہ گویا منزل میں ہے یعنی اپنے مقصد کو پہونچ گیا ہے پس ہم رنج راہ کیوں کھینچیں۔

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گل میں ہے؟
ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

غالب شوریدہ دل ایک پیچ وتاب کا طلسم ہے بس تو اپنی تمنا پر رحم کر اور اس کو غالب کے دل سے نکلنے دے تا کہ وہ (تمنا) اس طلسم پیچ وتاب کی کشمکش سے رہائی پائے۔ اس شعر میں مرزا نے تمنا کے برآنے کے مضمون کو نئی طرح سے ادا کیا ہے۔ امیر مینائی کا یہ شعر بھی سنئے۔

دل آپ کا کہ دل میں ہے جو کچھ سب آپ کا
دل لیجئے مگر مرے ارماں نکال کے

○

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراغ!
تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں!
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی
اڑتی پھرے ہے خاک مری کوے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی
دیکھو تو دلفریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی!

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

کہتا ہے کہ تمہارے جاتے ہی خودرفتگی وخودفراموشی کی یہ حالت ہوگئی کہ آج اور کل کی مطلق تمیز نہ رہی اور ایسا ہی قیامت کی نسبت بھی کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی و مستقبل دونوں مبدل بزمانہ حال ہو جائیں گے پس تم کیا گئے گویا قیامت گزر گئی۔ قیامت گزرنے کے دونوں معنی ہیں نہایت سختی کا زمانہ گزرنا اور خود قیامت کا آجانا۔" (یادگار غالب)

مارا زمانے نے، اسد اللہ خاں! تمھیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی؟

◆

تسکیں کو ہم نہ روئیں، جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

اگر حوران بہشت میں کوئی صورت تیری ہی سی ملے تو ہم تسکین کا غم نہ کریں کہ خیر ذوق نظر تو حاصل ہے۔ رہی تسکین دل وہ تیرے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اپنی گلی میں، مجھ کو نہ کر دفن، بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے؟

میرے پتے سے یعنی میرے مدفن کے پتے سے

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

ساقی گری کی شرم کرو یعنی مے باندازہ حوصلہ دو۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم!
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

نامہ بر سے میرا سلام کہو یعنی بطور طعن کے کیا خوب ہمارا کام کیا

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے
اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

○

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

یعنی اگر کچھ اور زندگی ہوتی تو ہم ترک محبت کی کوشش کریں گے۔

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے
دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر

کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے ناگہانی اور ہے

قاطع اعمار یعنی عمروں کے کاٹنے والے- وہ بلائے آسمانی اور ہے یعنی وہ ستمگر نجوم قاطع اعمار سے بڑھ کر ہے۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

○

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

نیند کے لفظ پر زور دیکر پڑھنے سے مطلب صاف ہو جاتا ہے یعنی موت کا البتہ ایک دن معین ہے کہ وہ اسی روز آئے گی آخر نیند کیوں نہیں آتی؟ کیا یہ بھی موت ہو گئی کہ بوقت معین ہی آئیگی۔

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی؟

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

داغِ دل ۔ گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی؟

چارہ گر داغ دل کے وجود کو مشتبہ سمجھتا ہے۔ شاعر اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اگر تجھ کو داغ دل نظر نہیں آتا تو کیا اس کی بوئے سوختہ بھی نہیں آتی پھر اشتباہ کا سبب کیا۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

موت آتی ہے یعنی آرزوئے مرگ میں۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے؟ غالب!
شرم تم کو مگر نہیں آتی!

○

دلِ ناداں! تجھے ہوا کیا ہے؟
آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟

گویا ابھی عشق کے کوچہ میں قدم رکھا ہے اور معشوق و عاشق میں جو راز نیاز کی باتیں ہوتی ہیں۔ ان سے ناواقف ہے اس لئے باوجود اپنے مشتاق ہونے اور معشوق کے بیزار ہونے پر تعجب

کرتا ہے (یادگار غالب)

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش! پوچھو کہ مدّعا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟
نگہِ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گُل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟
ہاں بھلا کر، ترا بھلا ہو گا
اور درویش کی صدا کیا ہے؟
جان تم پہ نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے؟
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟

○

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مُو آئے
یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

یہ تو تم سب دعا کرتے ہو کہ خدا کرے وہ بت غالیہ مو آئے۔ لیکن میری تمنا یہ چاہتی ہے کہ ایک بار تم سب گھبرا کے کہو کہ وہ آگئے۔

ہوں کشمکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت!
کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

بادہ نوشی کی صفت بیان کرتا ہے کہ اس کی بو سے البتہ نکیریں بھاگ جائیں گے ورنہ اور کوئی دوسری صورت ان کے ٹلنے کی نہیں ہے۔

جلّاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

ہاں اہلِ طلب! کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

اثر گریہ میں یعنی اثر گریہ کے باب میں "مگر مجھ کو ڈبو آئے۔" کیونکہ اس پر میرے رونے کی بے اثری ثابت ہو گئی۔

اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالبؔ
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

◆

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے
سینہ جویاے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز
پھر وہی پردۂ عماری ہے

وہی پردۂ عماری جس میں محبوب جلوہ گر ہے۔

چشمِ دلّالِ جنسِ رسوائی
دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے
وہ ہی صد رنگ نالہ فرسائی
وہ ہی صد گونہ اشکباری ہے

دل ہوائے خرام ناز سے پھر
محشرستانِ بے قراری ہے
جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے
روز بازارِ جاں سپاری ہے

یعنی جلوہ یار بھی پھر برسرناز ہے اور جان سپاری عشق کا بازار گرم ہے۔

پھر اسی بیوفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے
پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز
گرم بازارِ فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر
زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب
اشکباری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اس کی روبکاری ہے
بیخودی بے سبب نہیں غالبؔ!
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

○

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی

قاعدہ ہے کہ تکلیف کی حالت میں اگر تھوڑی دیر کو راحت مل جائے تو تکلیف و راحت کے مقابلے کی وجہ سے تکلیف کا احساس اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ اسی بنا پر کہتا ہے کہ ہم نے شادمانی کی (ترجمہ شادمانی کردم) یعنی کسی قدر لذت زندگانی حاصل کی تو اس سے ہمارے جنون پر خواہش تسکین کا الزام عائد نہیں ہو سکتا کیونکہ اس سے تو زخم دل پر اور بھی نمک پاشی ہو جاتی ہے۔

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی

کشاکش ہائے ہستی سے کوئی آزاد نہیں ہو سکتا مثلاً موج آب ہی کو لیجئے کہ اس کی روانی سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ آزاد ہے لیکن غور سے دیکھئے تو روانی ہی کی وجہ سے وہ پابند نظر آئیگی کیونکہ روانی موج سے زنجیر کی صورت نمودار ہو جاتی ہے۔

پس از مردن بھی دیوانہ زیارتگاہِ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گل فشانی کی

○

نکوہش ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبح محشر کی

چونکہ ستم یار کے فریادی کی سزا ملامت ہے اس لیے کہ کیا عجب کہ صبح محشر بھی نہ خندۂ دنداں نما ہو (یعنی آمادہ ملامت ہو) اس لئے کہ اس دن بیداد یار کی فریاد کی جائے گی اور آئین عشق میں یہ امر قابل ملامت ہے۔

رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے
اگر بو دے بجائے دانہ دہقاں نوک نشتر کی

اگر دشت مجنوں میں دہقان دانے کے بجائے نشتر نوک بوئے تو اتحاد حسن وعشق کے اثر سے نوک نشتر کی خلش رگہائے لیلیٰ کو بھی محسوس ہو۔ جس طرح لیلیٰ کی فصد کے ساتھ مجنوں کی فصد خود بخود کھل گئی تھی۔

پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

چونکہ دور ساغر کی روانی گرمئ مجلس پر منحصر تھی اور گرمئ محفل سوز پر پروانہ پر اس لئے پر پروانہ گویا کشتی مے کا بادباں ٹھہرا کہ اسی کی وجہ سے دور ساغر و کشتی مے ظہور میں آیا۔

کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت!
کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

پرفشانی بمعنی اڑنا۔ اڑنے سے پہلے ہی مرے شہپر سے طاقت پرواز جاتی رہی اب ذوق پرفشانی کی بیداد بیان سے باہر ہے کہ اڑنا چاہتا ہوں لیکن اڑ نہیں سکتا۔

کہاں تک روؤں اسکے خیمہ کے پیچھے قیامت ہے!
مری قسمت میں یارب! کیا نہ تھی دیوار پتھر کی؟

◆

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیان کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

گویا اپنی ہستی کو فنا قرار دیا جس کا وجود برائے نام صرف قسم کھانے کے لئے باقی ہے

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر!
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی؟ کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اللہ ری تیری تندیِ خُو جس کے بیم سے
اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے!

ان کے غصے کے خوف سے نالہ دل کا دل ہی میں رہ گیا۔ اور باہر نہ نکل سکا رزق ہم۔ رزق یکدگر۔

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نُبردِ عشق
جو پانو اٹھ گئے وہی ان کے عَلَم ہوئے

اٹھ گئے کہ دو معنی لئے گئے ہیں۔ ایک تو پاؤں اٹھ گئے بصورت شکست فرار کی حالت میں۔ دوسرے اٹھ گئے' معمولی معنوں میں یعنی بلند ہوئے اور علم فتح ٹھہرے۔

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھچ سکے سو وہ یاں آ کے دم ہوئے

(نثر) عدم میں چند نالے ہمارے سپرد تھے ان میں سے جو نالے وہاں نہ کھنچ سکے وہ دنیا میں

سانس کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ غالب اپنے سراپا درد ہونے کو اس پہلو سے بیان کرتا ہے کہ میرا ہر نفس گویا نالہ ہے۔

چھوڑی اسدؔ! نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

○

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی

گر محبت کی گرمی داغ دل نہ کرے تو افسردگی (جو خاموشی و محرومی سے پیدا ہوتی ہے) اس داغ کو مٹا دے۔ بے زبانی کا لفظ شعلے کی رعایت زبان کے لحاظ سے مناسب ہے۔

مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانہ جوانی!
کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی
یوں ہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا
کہ مرے عدو کو یارب! ملے میری زندگانی

یعنی دعا کرتا کہ عدو کو میری سی زندگی نصیب ہو جو سراپا مصیبت ہے۔

○

ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

شب غم کا جوش ہے یعنی اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ گویا سحر ناپید ہے۔ ہاں ایک دلیل صبح کی بود بد ہے یعنی بجھی ہوئی شمع اس راہ سے کہ چراغ صبح کو بجھ جایا کرتا ہے۔ لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیل صبح ٹھہرایا ہے وہ خود ایک سبب ہے منجملہ اسباب تاریکی کے۔ پس دیکھنا چاہیے کہ جس گھر

میں علامت صبح موئذ ظلمت ہو وہ گھر کتنا تاریک ہوگا (از عود ہندی۔ تبدیل عبارت از راقم)

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

آشتی چشم و گوش ہے کیونکہ دونوں محروم ہیں نہ کان کا مژدۂ نصیب ہے نہ آنکھ کا نظارہ جمال ہے۔

مے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق! یاں اجازتِ تسلیم ہوش ہے

ایسی حالت میں کہ شراب نے حسن خود آرا کو بے حجاب کر دیا ہے۔ اے شوق تجھ کو بھی اجازت ہے کہ ہوش و حواس یا صبر و ضبط کو کچھ دیر کے لئے چھوڑ دے۔

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا!
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست
بزمِ خیال، میکدۂ بے خروش ہے

محفل خیال کو میکدہ بے خروش قرار دیتا ہے جہاں دیدار بادہ ہے اور حوصلہ بمنزلہ ساقی اور نگاہ بمنزلۂ مست ہے۔ حوصلہ کو ساقی اس لئے کہا کہ تصور یار کی حالت میں عاشق کو اختیار ہے کہ بقدر حوصلہ اپنی نگاہ شوق کو شراب دیدار سے مستی اندوز کرے۔

○

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل!
زنہار! اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی، بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب، بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان، و کفِ گلفروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنت نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ! صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

○

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے
دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے
گریہ نکالے ہے تیری بزم سے مجھ کو
ہائے! کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر
خاک میں عُشاق کی غبار نہیں ہے
دل سے اٹھا لُطفِ جلوہ ہائے معانی
غیرِ گل آئینۂ بہار نہیں ہے

بہار کی نمود اسی وقت تک ہے جب تک کہ گل قائم ہے۔ لیکن چونکہ قیام شگفتگی گل ناپائیدار ہے اس لئے بہار بھی ناپائیدار ہے۔ بس اس سے بہتر ہے کہ دل سے جلوہ ہائے معانی کا لطف اٹھایا جائے۔ کیونکہ لطف سخن کی بہار بے خزاں ہے۔ یا یہ کہ جس طرح گل حسن بہار کا آئینہ ہوتا ہے اسی طرح دل میں حسن معانی کا جلوہ نظر آتا ہے۔

قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے
وائے! اگر عہد استوار نہیں ہے
تو نے قسم میکشی کی کھائی ہے غالبؔ!
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

◆

ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے
رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخمِ سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

اس مضمون کا ایک شعر اور بھی مرزا نے لکھا ہے۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالبؔ!
چٹکنا غنچۂ گل کا، صدائے خندۂ دل ہے

○

پا بہ دامن ہو رہا ہوں بس کہ میں صحرا نورد
خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے

میں صحرا نوردی کا عاذی تھا۔ اس لئے مجھ کو (بربنائے مایوسی مجبوری) اس طرح پر پابدامن بیٹھنا سخت تکلیف دہ ہے۔ پابدامن ہونیکی حالت میں چونکہ سرنگوں بیٹھے ہیں اور نگاہ زانو کی جانب ہوتی ہے۔ اس لئے آئینہ زانو کا استعارہ استعمال کیا اس آئینہ کا جوہر وہ کانٹے ہیں جو پائیوں میں چبھے تھے۔

دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت
ہے نگاہِ آشنا تیرا سرِ ہر مُو مجھے
ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

○

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں، کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے
سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

اس قد دلکش سے یعنی "اس قد دلکش کے ساتھ" ترجمہ ہے "بایں قد دلکش" کا

تب نازِ گرانمایگیِ اشک بجا ہے
جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آوے

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر!
کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

اس چشمِ فسونگر کا اگر پائے اشارا
طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب!
اک آبلہ پا وادیِ پرخار میں آوے

مر جاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زنار میں آوے

غارتگرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل، باغ سے بازار میں آوے

تب چاکِ گریباں کا مزا ہے دلِ ناداں!
جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آوے

آتشکدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

○

حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے
بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خُوئے سوال اچھا ہے
ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے
قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے
خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

حضرت سلطان بہادر شاہ ظفر۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن

دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ! یہ خیال اچھا ہے

○

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

خار خارِ المِ حسرتِ دیدار تو ہے
شوقِ گلچینِ گلستانِ تسلی نہ سہی

اگر شوق تسلی کے گلستاں کا گلچیں نہیں ہے یعنی اگر شوق کو تسلی حاصل نہیں ہوتی تو نہ سہی اس کے لیے حسرت دیدار کا رنج کافی ہے۔

مے پرستاں! خمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا
گر نہیں شمع سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

(نثر) اگر نفس قیس (جو چشم و چراغ صحرا ہے) شمع سیہ خانہ لیلیٰ نہیں ہے تو نہ سہی سیہ خانہ لیلیٰ خیمہ سیاہ لیلیٰ کی مناسبت سے کہا۔ غالب نے اس شعر میں عشق کی شان استغنا کا اظہار کیا ہے۔

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالبؔ! اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

○

عجب نشاط سے جلّاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سایہ سے سر پانو سے ہے دو قدم آگے

سر کے شوقِ شہادت کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ جیسا کہ سائے میں ہوتا ہے پاؤں سے بھی دو قدم آگے ہو۔

قضا نے تھا مجھے چاہا، خرابِ بادۂ الفت
فقط خراب لکھا بس، نہ چل سکا قلم آگے
غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے
خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے
یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
تمھارے آئیو اے طرہ ہائے خم بہ خم آگے

بددعا میں دعا کا پہلو نکالا ہے کیونکہ پریشان ہونا زلف کی صفت ہے۔

دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے
قسم جنازہ پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب!
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

○

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

یہ بھی نہ کہو کہ وہ بے مہر شکوہ کے نام سے خفا ہو جاتا ہے کیونکہ ایسا کہنا بھی تو شکوے میں داخل ہوگا۔

پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو!
شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے

اگرچہ محبوب کو یہ خبر نہیں ہے کہ اس کا سرگرم جفا ہونا ایک طرح پر حسن تلافی ہو جائے گا۔ بقول غالب

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

اس پر بھی۔ شکوۂ جور سے سرگرم جفا ہوتا ہے۔

عشق کی راہ میں ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال
سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

○

(قطعہ)

خامہ میرا کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے
اے شہنشاہِ کواکب سپہ و مہرِ علم!
تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے
سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے
تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے
ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال
آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے
میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزلخوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے
رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

○

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تُو کیا ہے
تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

نہ شعلہ میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تُند خُو کیا ہے
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدوُ کیا ہے

رقیب جو مری بدگوئی کرتا ہے اس کا مجھے اندیشہ نہیں البتہ رشک اس بات کا ہے کہ وہ تجھ سے ہم کلام ہوتا ہے۔

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے
جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہو گا
کریدتے ہو جو اَب راکھ جستجو کیا ہے
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے
وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گُلفامِ مشکبو کیا ہے؟
پیوں شراب اگر خُم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے
رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے
ہوا ہے شہہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

◆

میں انھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پیے ہوتے
قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاش! کہ تم مرے لیے ہوتے
میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے
آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

◆

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم
دھوئے دھبے جامۂ احرام کے
دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمھارے دام کے

شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر
دیکھیے کب دن پھریں حمام کے
عشق نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

○

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر
روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کے دیکھنے کے لیے
چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد پیمائی

جب ہوا میں شراب کی تاثیر ہے تو باد پیمائی کار بے فائدہ ہے۔

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ
شاہِ دیں دار نے شفا پائی

* * *

تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجئے تو جا میری بھی خالی ہے

میرے عجز کا درجہ یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ میں تغافل کو دوست رکھنے لگا ہوں پس اس صورت میں ظاہر ہے کہ اگر آپ پہلو تہی کریں گے تو گویا میرا پاس کریں گے کیونکہ میں تغافل اور پہلو تہی کو دوست رکھتا ہوں بمصداق

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

قاعدہ ہے کہ محفل میں لوگ عام طور پر اپنی نمود اور خاطر چاہتے ہیں لیکن بعض لوگ بمقتضائے کمال کسر نفسی ہی چاہیے ہیں کہ ان کی آؤ بھگت نہ ہو۔ ایک بات اور بھی قابل غور ہے کہ اگر محفل محبوب میں اور لوگوں کے ساتھ کوئی اس سے سچی محبت رکھنے والا بھی تو ہو یہ بات یقینی ہے کہ محبوب اوروں سے مخاطب ہوگا اور اس سے تغافل کرے گا۔ اہل دل پر روشن ہے کہ یہ تغافل التفات سے بہتر ہے۔

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے۔
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

یعنی اہل ہمت کے نہ ہونے سے عالم آباد رہا۔ کیونکہ اہل ہمت دنیا کو ہیچ سمجھ کر اس کی جانب التفات نہ کرتے اور دنیا ویران ہو جاتی دوسرا مصرعہ مثالیہ ہے۔

* * *

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلشِ غمزۂ خونریز نہ پوچھ!
دیکھ خونابہ فشانی میری۔

کیا بیاں کر کے مرا روئینگے یار
مگر آشفتہ بیانی میری

ہوں زخود رفتۂ بیدائے خیال
بھول جانا ہے نشانی میری

یعنی میری خونابہ فشانی کو دیکھ کر اس کے غمزۂ خون ریز کی خلش کی کیفیت واضح ہو جائیگی۔

متقابل ہے مقابل میرا
رُک گیا دیکھ روانی میری

میں صحرائے خیال کا از خود رفتہ ہوں اور از خود رفتگی ہی میری نشانی یا پہچان ہے۔

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں ہے گرانی میری

گرد بادِ رہِ بیتابی ہوں
صرصرِ شوق ہے بانی میری

متقابل ہے یعنی بہ تصنع مقابل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حریف میری روانی۔ (اروانی طبع) کو دیکھ کر در حقیقت قایل ہو گیا۔ لیکن ظاہر میں محض اپنی بات کی پچ کے لئے بہ تصنع مقابلہ کئے جاتا ہے۔ راقم نے اس شعر کے یہ معنی لکھے تھے لیکن بعد کو عود ہندی میں مرزا صاحب کا ایک خط مولوی عبدالرزاق صاحب شاکر کے نام نظر سے گزرا جس میں اس شعر کے متعلق لکھا ہے:۔

''تقابل و تضاد کو کون نہ جانے گا۔ نور و ظلمت' شادی و غم' رنج و راحت' وجود و عدم لفظ مقابل اس مصرع میں بمعنے مرجع ہے جیسے حریف کہ بمعنی دوست کے بھی مستعمل ہے مفہوم شعر یہ ہے کہ ہم اور دوست از روئے خود عادت ضد ہمدیگر ہیں۔ وہ میری طبع کی روانی دیکھ کر رک گیا۔ گرد باد یعنی بگولا جو ہوائے تیز سے پیدا ہوتا ہے۔ شاعر اپنے کو راہ بیتابی کا گرد باد قرار دیتا ہے جو صرصر شوق سے پیدا ہوا ہے۔

دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا
کھل گئی ہیچ مدانی میری
کر دیا ضعف نے عاجز غالبؔ
ننگِ پیری ہے جوانی میری

◆

نقش نازِ بتِ طناز بہ آغوش رقیب
پائے طاؤس پے خامۂ مانی مانگے

یعنی آغوش رقیب میں اس بت طناز کی تصویر ناز کے لئے خامۂ مانی کے بجائے پائے طاؤس کی ضرورت ہے۔ طاؤس حسین ہوتا ہے لیکن پائے طاؤس بدنما ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے نقش ناز بت طناز خوب ہے لیکن 'بآغوش رقیب' ٹھیک نہیں 'پائے طاؤس' کے قلم کی اسی مناسبت سے ضرورت ظاہر کی گئی۔

تو وہ بد خُو کہ تحیّر کو تماشا جانے
غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے
وہ تپِ عشقِ تمنا ہے کہ پھر صورتِ شمع
شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

وہ تپ عشق تمنا ہے، ترجمہ 'آں تپ عشق تمنا دارم کا' یعنی مجھ کو ایسے تپ عشق کی تمنا ہے جس کا شعلہ......الخ

◆

گلشن کو تری صحبت از بس کہ خوش آئی ہے
ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

واں کنگر استغنا ہر دم ہے بلندی پر
یاں نالہ کو اور الٹا دعوائے رسائی ہے
از بسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے
جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

داغ صورت میں آنکھ سے مشابہ ہوتا ہے پس داغ گویا نالہ وفریاد پر چشم نمائی کرتا ہے اور ضبط کی تاکید کرتا ہے۔

○

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رُفو کی
لکھ دیجیو یارب! اسے قسمت میں عدو کی

اپنی ایذا دوستی کا ثبوت دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں ایسا زخم نہیں چاہتا جس کے رفو کی تدبیر ہو سکتی ہو۔

اچھا ہے سر انگشتِ حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی
کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے؟
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی
دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی
صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالبؔ!
حسرت میں رہے ایک بتِ عربدہ جُو کی

○

سیماب پشت گرمیِ آئینہ دے ہے ہم
حیراں کیے ہوئے ہیں دلِ بیقرار کے

پہلا مصرع مثالیہ ہے دل بیقرار کو سیماب سے اور اپنی حیرانی کو آئینہ سے مشابہ کیا ہے مطلب یہ ہے کہ جس طرح پارہ کی قلعی سے شیشہ آئینہ بن جاتا ہے اسی طرح بیقراری نے مجھ کو آئینہ حیرت بنا دیا ہے۔

آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب! چل کہ چلے دن بہار کے

○

ہے وصل و ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں
معشوق شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے

کہتا ہے کہ وصل میں محبوب کی جانب سے شوخی اور عاشق کی جانب سے بیباکی کا اظہار ہونا چاہیے کیونکہ اگر اس حالت میں بھی ضبط و تمکین کا لحاظ رکھا جائے گا تو ایسا وصل بھی گویا ہجر ہی رہے گا۔

اس لب سے مل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں
شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے

○

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

صحبت رنداں سے واجب ہے حذر
جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل!
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے
چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے
دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

کہتا ہے کہ تم مجھ سے خصوصیت کے ساتھ منہ چھپانا چھوڑ دو یعنی جس طرح سب کے ساتھ بے تکلف بے حجاب اور بیگانہ وار رہتے ہو اسی طرح میرے ساتھ بھی رہو کیونکہ اس قسم کی بیگانگی دوستی کا پردہ ہوتی ہے یعنی اس سے لوگوں کو محبت کا حال نہیں معلوم ہونے پاتا۔

دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے، دیکھا چاہیے

دیکھنا چاہیے کہ رقیب میرا کس درجہ دشمن ہے کہ میری دشمنی کے پیچھے آپ بھی تباہ ہو گیا کیونکہ محبوب اس سے بھی بدگمان ہو گیا۔

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے
منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

غافل! ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے
چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

* * *

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

اپنی رفتار کی ناکامی کا بیان بہ غلو کرتا ہے کہ ہر قدم پر بجائے نزدیک ہونے کے منزلِ مقصود دور ہوتی جاتی ہے۔

درسِ عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر
ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

ظاہر ہے کہ رشتۂ شیرازۂ مژگان غیر محسوس ہوتا ہے پس مطلب یہ ٹھہرا کہ کتاب دیدار کے عنوان کا درس یا (بحذف استعارات) محبوب کے دیدار کا لطف اسی حالت میں ہے کہ ہم اسے دیکھیں اور اسے ہمارے اس دیکھنے کا علم نہ ہو۔

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں
صورتِ دُود رہا سایہ گریزاں مجھ سے
غمِ عُشّاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں
کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

یعنی یہ مناسب نہیں ہے کہ عشاق کے غم میں محبوب ترک آرائش کر کے سادگی اختیار کرے اور آئینہ دیکھنا چھوڑ دے اور اس طور پر خانہ آئینہ ویران ہو جائے۔

اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں
صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

آبلے کو گوہر روشن اور جادہ صحرا کو رشتۂ گوہر سے مشابہ کیا ہے۔

بیخودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو
پُر ہے سایے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

بہ طفیل بے خودی (جس کو بستر تمہید فراغت ہونا نصیب رہے) میرا شبستاں مجھ سے پر ہے جس طرح سائے کا شبستاں سائے سے پر ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بر بنائے بیخودی میں مثل سایہ اپنی جگہ بہ آرام پڑا ہوا ہوں۔

شوقِ دیدار میں گر تُو مجھے گردن مارے
ہو نگہ مثلِ گلِ شمع پریشاں مجھ سے

شمع کا گل جب کترا جاتا ہے تو اس کے اجزاء پریشان اور برہم ہو جاتے ہیں۔ غالب کہتا ہے کہ اگر تو مجھے گردن مارے تو میری نگاہ بر بنائے شوق دیدار گل شمع کی مانند پریشان ہو جائے یعنی ایک نگاہ کی کئی نگاہیں ہو جائیں۔

بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہے ہے!
سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

بقول شاعر۔

کسی کا کب کوئی روزِ سیہ میں ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

برابر کے کیا خوب بلیغ مصرعے لکھے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جلوہ حسن کا تعلق تجھ سے ہے اور

حیرت عشق کا مجھ سے

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ!
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

○

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل!
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش! یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے
غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے
اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آویں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے
کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے
موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

موت کی راہ دیکھنے سے کیا فائدہ کہ وہ تو خواہ مخواہ آ ہی گئی۔ تمہاری خواہش کرنا چاہیے کہ اگر تم

نہ آؤ تو مجھے بلائے بھی نہ بن پڑے۔

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ!
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

○

چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے
صبح کی مانند زخمِ دل گریبانی کرے

عریانی کی حالت میں اگر وحشت کو گریباں چاک کرنے کی خواہش پیدا ہو تو میرا زخم دل صبح کے مانند گریباں بن کر چاک ہو۔

جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجے خیال
دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

ہے شکستن سے بھی دل نومیدِ یارب! کب تک
آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے

ہم کب تک یہ خواہش ظاہر کریں کہ وہ سنگدل تغافل شعار ہماری دل شکنی ہی کرے اور اور وہ اس پر بھی متوجہ نہ ہو۔ یعنی تغافل شعاری اسے دل شکنی کی بھی اجازت نہ دے۔

میکدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پاوے شکست
موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

اگر میکدہ محبوب کی مست ناز آنکھ سے شکست پائے تو ساغر میں جو بال پڑیں وہ گویا دیدہ ساغر کے لئے پلکیں بن جائیں اور چشم ساغر چشم یار کے مقابلے میں محجوب و مغلوب نظر آئے۔

خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد
یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

خط عارض سے یعنی بذریعہ خط عارض۔ عارض یار پر جو خط نمایاں ہوا ہے وہ ایک عہد نامہ ہے جو الفت نے زلف کو لکھ دیا ہے کہ میرے حق میں پریشانی کو جو کچھ کرنا ہو کرے مجھے سب منظور ہے۔

○

وہ آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے
کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے
دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے
پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے
اسد! خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پانو داب تو دے
تپش سے میری وقفِ کش مکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے مرا تن بارِ بستر ہے
سرشکِ سر بصحرا دادہ نور العینِ دامن ہے
دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو
فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے

تمہارے آنے کی وجہ سے طالع بیدار بستر فروغ شمع بالیں ہے۔ یعنی طالع بیدار کی درخشندگی شمع بالیں کی روشنی سے بھی بڑھ گئی ہے۔

بہ طوفاں گاہ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

بر بنائے اضطرابِ شامِ فراق، ہر تار بستر شعاع آفتاب قیامت سے مشابہ ہے۔

ابھی آتی ہے بو بالش سے اس کی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

ابھی بالش سے محبوب کے گیسوئے معتبر کی خوشبو آتی ہے۔ یعنی شب وصل کو گزرے ہوئے کچھ بہت زمانہ نہیں ہوا۔ ایسی حالت میں زلیخا کی طرح صرف خواب میں دیدار یار کا حاصل ہونا ہمارے بستر کے لئے موجب عار ہے۔

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالبؔ
کہ بیتابی سے ہر یک تارِ بستر خارِ بستر ہے

○

خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہو جاوے
غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جاوے

رگِ گردن بحالت غرور وغیظ پھول جاتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ محبوب کو میری دوستی پر اس درجہ اعتماد اور غرور ہے کہ مجھ کو ڈر ہے کہ کہیں رشتہ الفت رگ گردن نہ ہو جائے۔ یعنی محبت مبدل بہ دشمنی نہ ہو جائے۔

حد سے نہ بڑھ چلیں تری غفلت شعاریاں
اس درجہ اعتبارِ تمنا نہ چاہیے
(حسرت موہانی)

سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشوونما غالبؔ!
اگر گل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جاوے

یعنی اس قدر ہجوم گل نہ ہو کہ سروان میں پوشیدہ ہو جائے۔

○

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے
کیوں بوتے ہیں باغبان تونبے؟
گر باغ گدائے مے نہیں ہے

یعنی تونبوں کی باغ میں موجودگی ثابت کرتی ہے کہ باغ بھی گدائے مے ہے کیونکہ تونبوں سے کشکول گدائی اور کدو سے شراب بنتا ہے۔

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے

تجھ سے یعنی تیری مانند۔

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے
اُردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے

کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد؟
مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ!
آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

ردیف غزل میں الفاظ نہیں ہے نہیں ہے کو بار بار لانے کے سبب سے غالب نے از راہ شوخی اپنا نام ہی نہیں ہے۔ قرار دے لیا ہے اور دریافت کرتا ہے کہ جب ہستی کی نسبت تو کہتا ہے کہ نہیں ہے۔ اور عدم کے باب میں بھی تیرا یہی قول ہے کہ نہیں ہے تو اے نہیں ہے یعنی اے غالب یہ تو بتا کہ آخر پھر ہے کیا!

◆

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

ریزہ الماس سے زخم اور بھی بڑھ جاتا ہے ریزہ الماس کو زخم دل کا مرہم کہہ کر اپنی ایذا دوستی کا اظہار کیا ہے۔

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

پہلے تغافل نادانستہ تھا یعنی بر بنائے بیگانگی تھا۔ لیکن اب دانستہ ہے جس کو حقیقت التفات کہنا چاہیے۔ اگرچہ ہم بظاہر ایسا نہ کرسکیں۔

◆

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

وہی مضمون ہے کہ ”میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے۔“ یہ انتہائی رشک ہے کہ اپنے اوپر بھی رشک آتا ہے۔

در پردہ انھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردا ہے کہ پردا نہیں کرتے

وہ جو غیر سے بے تکلف ملتے ہیں۔ اس سے غرض یہ ہے کہ لوگوں کو یہ نہ معلوم ہو کہ ان کو رقیب کے ساتھ کوئی خاص تعلق ہے۔ گویا ان کے پردہ نہ کرنا ایک پردہ ٹھہرا جس سے غیر کے ساتھ ان کے ربطِ نہانی کا راز پوشیدہ رہتا ہے۔ یہ وہی مضمون ہے کہ

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی   منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے
غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

یعنی غالب کے سے عاشقِ صادق کو جب تم برا کہتے ہو تو رقیب بوالہوس کو پھر تم سے کیا امید رہے گی۔

◆

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

شراب تیرے لب سے کسب رنگ کرتی ہے پس گویا وہ گلچیں ٹھیرا اور خط ساغر نگاہ گلچیں۔

کبھی تو اس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے!
کہ ایک عمر سے حسرت پرست بالیں ہے

بجا ہے گر نہ سنے نالہائے بلبلِ زار
کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

نمِ شبنم کو اس کی سفیدی کے اعتبار سے پنبہ کہا۔ یہ روئی گویا گوشِ گل کو بند کیے ہوئے ہے۔

اسدؔ ہے نزع میں چل بیوفا برائے خدا!
مقامِ ترک حجاب و وداعِ تمکیں ہے

○

کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محوِ تغافل کیوں نہ ہو
یعنی اس بیمار کو نظّارہ سے پرہیز ہے
مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائیگی
وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے!
عارضِ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ!
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

……☆……

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے
ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیے

دیا ہے دل یعنی نامہ بر نے۔ اس کو یعنی محبوب کو۔

یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے؟

اجل آئے گی ضرور مگر آج جب ہم چاہتے ہیں تو ضد کی وجہ سے نہیں آئی۔

رہے ہے یوں گہ و بے گہ کہ کوئے دوست کو اب
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے؟

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہیے؟
سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ سرِ رہگذر ہے کیا کہیے؟
تمھیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہیے!

محبوب نے پوچھتا ہے کہ ہمارے ہاتھ میں کچھ چیز ہے کہئے کہ وہ کیا چیز ہے۔ پہلے مصرع میں اس شے یعنی سررشتہ وفا کا نام بھی ظاہر کر دیا ہے جس سے مقصد یہ ہے کہ محبوب وفا سے اس درجہ بیگانہ ہے کہ بتا دینے پر بھی اس کو یہ نہ معلوم ہو سکے گا کہ ہمارے ہاتھ میں سررشتہ وفا ہے۔

انھیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑیے؟
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے کیا کہیے
حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے
کہا ہے کس نے کہ غالبؔ برا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے؟

○

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

دامن افشانی سے ترک تعلقات دنیاوی مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ترک تعلقات کی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ عریاں رہ کر تعلقات لباس سے آزاد ہو جاؤں گا لیکن بحالت

عریانی بھی جسم کی پابندی باقی رہی اور کامل آزادی نصیب نہ ہوئی۔

بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فسان
مرحبا میں کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے

کیوں نہ ہو بے التفاتی اس کی خاطر جمع ہے
جانتا ہے محوِ پرسش ہائے پنہائی مجھے

محبوب کو خوب معلوم ہے کہ اس کی بے اعتنائی مجھ کو ناگوار نہ ہوگی۔ اسی باعث سے وہ اظہار بے التفاتی میں بے باک ہے۔ پرسش پنہاں وہ پرسش جو بذریعہ الفاظ نہ ہو۔

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

یعنی غمخانے کی ویرانی کے اسباب میں سے ایک سبب میری ذات بھی قرار پائی یا یہ کہ اسباب کے بجائے مجھ کو اسباب ویرانی ملا۔

بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاشکے!
اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے

وائے! واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

وعدہ آنے کا وفا کیجے' یہ کیا انداز ہے؟
تمنے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

یعنی ہر وقت انتظار میں میری نگاہ دروازے پر لگی رہتی ہے' کیجے' کے ساتھ: ''ستم'' اب ناجائز ہے۔

ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ واہ!
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزلخوانی مجھے
دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالب! یوسفِ ثانی مجھے

○

یاد ہے شادی میں بھی ' ہنگامۂ "یارب" مجھے
سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے

جس طرح دانہائے تسبیح سے صورت خندہ نمایاں ہوتی ہے لیکن ان پر ذکر یارب ہوتا ہے اس طرح سے مجھے شغل شادی میں بھی ہنگامہ فریاد یاد رہتا ہے یارب کے الفاظ میں ایہام ہے۔

ہے کشادِ خاطرِ وابستہ در رہنِ سخن
تھا طلسمِ قفلِ ابجد خانۂ مکتب مجھے

قفل ابجد ایک قسم کا قفل ہوتا ہے جس میں بہت سی پھرکیاں ہوتی ہیں۔ جن پر مختلف حروف کھدے ہوتے ہیں۔ اس قفل کے کھولنے کے لیے یہ امر ضروری ہوتا ہے کہ اس کی پھرکیاں گھما کر اس طور پر مرتب کیجائیں کہ ان کے حرفوں سے ملکر ایک مقرر شدہ لفظ بن جائے گویا قفل ابجد کا وا ہونا لفظ مقرر کے بننے پر موقوف ٹھہرا یا بالفاظ دیگر یوں کہیئے کہ قفل ابجد کا وا ہونا ور رہن سخن ٹھہرا۔ غالب اپنی خاطر وابستہ کو بھی اس قفل ابجد سے مشابہ کر کے کہتا ہے کہ میری گرفتہ خاطری کا عالج شغل شعر و سخن ہے۔

یا رب! اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے؟
رشکِ آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے
طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں!
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

چونکہ میں حسرت و یاس کا لذت خواہ ہوں اس لئے میری آرزو سے شکست آرزو مراد ہے۔ کیونکہ بغیر شکست آرزو کے لذت حسرت کیونکر مل سکتی ہے!

دل لگا کر آپ بھی غالبؔ مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

○

حضور شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے
قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے
کریںگے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اس خستہ کے نیروے تن کی آزمائش ہے
نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی!
اسے یوسف کی بوے پیرہن کی آزمائش ہے

نسیم مصر جو بوئے یوسف اپنے ہمراہ لائی ہے وہ حضرت یعقوبؑ کی ہوا خواہی کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس لئے ہے کہ بوئے پیراہن یوسفؑ کی آزمائش کرے کہ پیر کنعاں پر اس کا اثر کہاں تک ہوتا ہے۔

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے
رہے دل ہی میں تیر اچھا جگر کے پار ہو بہتر
غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

نہیں کچھ سبحہ و زنّار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

پڑا رہ اے دلِ وابستہ! بیتابی سے کیا حاصل
مگر پھر تابِ زُلفِ پُرشکن کی آزمائش ہے

اس زلف پرشکن کے پیچ وخم ایسے نہیں کہ دل ان سے رہا ہو سکے۔ دل وابستہ کئی بار اس کا تجربہ کر چکا ہے۔ اب جو یہ بیتابی کرتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید پھر اسے تاب زلف پرشکن کی آزمائش ہے:

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

وہ آوینگے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالب!
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

نیا فتنہ یعنی ان کے آنے کا فتنہ

○

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفائیں کرکے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

خدایا! جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

وہ بدخو اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

ادھر وہ بد گمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے
سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی! کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
تکلف برطرف نظّارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے
ہوئے ہیں پانو ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے
قیامت ہے کہ ہووے مدّعی کا ہم سفر غالبؔ!
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

○

زبسکہ مشقِ تماشا' جنوں علامت ہے
کشاد و بستِ مژہ سیلیِ ندامت ہے

چونکہ تماشائے حسن' کی مشق جنون کی علامت ہے اس لئے بروقت تماشا پلکوں کا کھلنا اور بند ہونا گویا سیلی ندامت کا پڑنا ہے۔

نہ جانوں کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی
تجھے کہ آینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

خدا جانے بدعہدی کا نشان کب مٹے گا۔ یعنی تو لاکھ آزمائش و زیبائش کرے مگر اس داغ بدعہدی کے ہوتے ہوئے۔ جب تو آرائش کے لئے آئینہ دیکھتا ہے تو وہ بھی تیرے لئے ورطۂ ملامت بن جاتا ہے۔ آئینے کی تشبیہ ورطہ سے ظاہر ہے اور آرائش چونکہ اغیار کے دکھانے کے لئے

کی جاتی ہے۔ اس لئے اس سے بدعہدی لازم ہے۔

بہ پیچ و تابِ ہوس سلکِ عافیت مت توڑ
نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

یعنی سلامتی عاجزی اور کم ہوسی ہی میں ہے ورنہ ہوس کے ساتھ عافیت کا وجود ممکن نہیں۔

وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد
جنون ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے

محبوب اور رقیب کے معاملے کا ذکر بطور طعن کرتا ہے کہ بڑا ستم ہے کہ محبوب تو آمادۂ وفا ہوا اور دعویٰ عشق جھوٹا ہوا۔ یہ تو اسی قسم کی بات ہوئی کہ بہار تو واقعی آئی ہو لیکن جنوں میں بناوٹ ہو۔

○

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے
کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آ جائے رحم
واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے
منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا پر بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے
یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زلف گر بن جاؤں تو شانہ میں الجھا دے مجھے

○

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
ایک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
ایک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

میرے ہوتے یعنی مجھ صحرا گرد کے ہوتے۔ میرے آگے یعنی مجھ اشک بار کے ہوتے۔

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

یعنی جس طرح تو میرے آگے کشمکش حیا و شوخی کے ہاتھوں دل تنگ و مجبور ہو کر بیٹھا ہے۔ اسی طرح میں تیرے پیچھے تنگ دل اور پریشان رہتا ہوں۔

سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں؟
بیٹھا ہے بُتِ آینہ سیما مرے آگے

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا
کیوں کر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

ہجر میں وہ جو میں اکثر مر جانے کی آرزو کیا کرتا تھا اور وہ آرزو وصل کی شب میرے آگے آئی یعنی اس صورت سے میں شادی مرگ ہو گیا۔

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش! یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

○

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے
تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے؟

نہ کہیو طعن سے پھر تم کو ہم ستمگر ہیں
مجھے تو خُو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے

یعنی اگر تم بطور طعن کہو گے کہ ہم ستمگر ہیں۔ تو اس پر بھی میں حسب عادت کہوں گا کہ بجا ہے۔ اس وقت خفا نہ ہونا۔

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جاوے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے!

نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے

اپنی ایذا دوستی کا اظہار کرتا ہے اور زخم تیغ کو زخم تیر پر ترجیح دیتا ہے کیونکہ زخم تیغ بڑا اور کشادہ ہوتا ہے۔

جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے
جو ناسزا کہے اس کو نہ ناسزا کہیے
کہیں حقیقتِ جانکاہیِ مرض لکھیے
کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے
کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے
کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے
رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے
نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے
روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے

یعنی اگر محبوب کو ہم سے الفت نہیں ہے تو اس کی محبوبی میں کیا فرق آ سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس کے عیوب سے چشم پوشی کر کے صرف قابل تعریف باتوں کو لینا چاہیے۔ اس کے بعد والے شعر کا مفہوم بھی یہی ہے۔

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ!
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے!

○

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے
صرفِ بہاے مے ہوئے آلاتِ میکشی
تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

دو حساب یعنی اول یہ کہ شراب کے لئے قیمت کہاں سے آئے۔ دوسرے یہ کہ ظروف مے کا جھگڑا کون رکھے۔ سو یہ دونوں جھگڑے اس طرح طے ہوئے کہ آلات میکشی کو فروخت کر کے شراب پی لی۔

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے
کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر؟
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے
پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا!
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے
کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

اس رنگ سے اٹھائی کل اسنے اسدؔ کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

○

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مستِ طرب
شیشۂ مے سرو سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے

نغمہ کو با اعتبار روانی آواز جوئبار کہا اور شیشۂ مے کو با اعتبار سبزی اس جوئبار کا سرو سبز قرار دیا۔ اس حالت سرور میں نشے کو رنگ سے شاداب اور ساز کو نشہ طرب سے سرشار ٹھیرایا۔

ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست
واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

یعنی میری نالہ کشی برہمیٔ بزم یار کا موجب نہیں ہوسکتی کیونکہ اس کی محفل عیش میں جا کر میرا نالہ بھی نغمہ بن جاتا ہے۔

○

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے
دعوےِ جمعیتِ احباب جاے خندہ ہے

مصرعۂ اولیٰ ثبوت مثالی ہے مصرعہ ثانی کا۔

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل
یک جہاں زانو تامل درقفاے خندہ ہے

یک جہاں زانو بمعنی کثرت۔ غنچہ کھلنے کے بعد محوِ عبرت ہے کہ میرا بھی وہی انجام ہونیوالا ہے جو اور پھولوں کا ہوا "عدم میں" اس لئے کہ کھلنے کے بعد غنچہ معدوم اور گل پیدا ہو گیا۔

کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام
ورنہ دنداں در دلِ افشردن بنائے خندہ ہے

افسردگی کے ہوتے ہوئے عیش بیتابی حاصل نہیں ہو سکتا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بیتاب ہونا اور خون جگر کھانا یہی چیزیں محبت میں بنائے عیش ہیں۔

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

سوز دروں سے آنسو خشک ہو جاتے ہیں اور دل کا محیط گریہ ہونا ظاہر نہیں ہونے پاتا۔ ورنہ حال یہ ہے کہ اگرچہ "لب آشنائے خندہ" ہے لیکن دل "محیط گریہ" ہے۔ یعنی اگرچہ بظاہر میں خوش ہوں لیکن میرا باطن مبتلائے غم ہے۔

۵

حسن بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

خریدار متاع جلوہ یعنی خواہشمند جلوہ گری۔ فکر اختراع جلوہ یعنی اس بات کی فکر کہ جلوہ گری کی خواہش کس طور سے پوری ہو۔ آئینے کو فکر اختراع جلوہ کا زانو قرار دیا۔ اس لحاظ سے کیا وقت آرائش آئینہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حسن باوجودیکہ بے پروا ہوتا ہے لیکن جلوہ گری کی فکر اس کو بھی رہتی ہے چنانچہ آئینہ گویا اس خواہش جلوہ گری کا زانوئے فکر ہوتا ہے۔

تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن
چشم وا گردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

چشم وا گردیدہ آغوش سے مشابہ ہے جو جلوہ ناپائدار کو رخصت کرنے کے لئے کھلی ہے۔ غالب "آگاہی" سے پوچھتا ہے کہ تو کب تک مصروف تماشائے جلوہ ظاہر رہے گی۔

○

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سربسر
کب تک خیالِ طُرّۂ لیلا کرے کوئی

افسردگی نہیں طرب انشائے التفات
ہاں! درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

سراپا درد بن جانے سے ممکن ہے کہ اس کو دل میں جگہ ہو سکے ورنہ افسردہ خاطر ہو کر بیٹھ رہنے سے التفات یار کی امید فضول۔

رونے سے اے ندیم! ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو' عقدۂ دل وا کرے کوئی

چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی
کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

یعنی جب چاک جگر سے کچھ حاصل نہ ہوا تو اب گریباں دری سے بجز رسوائی اور کیا ہاتھ آئیگا۔

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل
تاچند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

صحرا میں چونکہ میرے دل و جگر کے ٹکڑے ہر ہر کانٹے میں چھدے پڑے ہیں۔ اس لئے ہر خار میں گل کی اور جنگل میں چمن کی صورت نمایاں ہو گئی ہے غالب کہتا ہے کہ اس صحرائے گلشن نما کی کب تک کوئی باغبانی کرے۔

ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست
نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

جنون سے معاملہ کرنے میں نقصان نہیں کیونکہ ہر سنگ و خشت (جو لڑکے دیوانوں کو مارتے ہیں) گویا ایک صدف ہی جس سے گوہر شکست حاصل ہوتا ہے۔ اس معاملے کی سودمندی کی حقیقت ظاہر ہے۔

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز
یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

ایجاد کی طبیعت میں جو وحشت ہے وہ یاس خیز ہے یعنی ہم وحشی طبع لوگ یاس کو ایجاد کیا کرتے ہیں اور اس طرح پر گویا مایوس ہونے پر مجبور ہیں۔

بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ!
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

◆

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی جو بے تلوار کے قتل کرتا ہو اور جس پر حد شرعی نہ جاری ہو سکتی ہو۔ یا یہ کہ جس پر بسبب نزاکت حسن کوئی حد شرعی کا جاری کرنا گوارا نہ کرتا ہو

چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی!

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند!
کس کی حاجت روا کرے کوئی!

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلا کرے کوئی!

○

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

تمھاری طرزِ و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

یعنی رقیب پر جو تمہارا لطف ہے وہی مجھ پر ستم ہے۔

سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی
یقیں ہے ہمکو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

○

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

جوہرِ تیغ بہ سر چشمۂ دیگر معلوم
ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اگاتا ہے مجھے

مطلب یہ ہے کہ جس طرح جوہرِ تیغ کی نمود تلوار کو زہراب میں بجھانے سے ہوتی ہے اسی طور پر میری سرشت غصہ و غم سے ہے۔

مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے
آئنہ خانہ میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے

حصولِ مدعا سے دل ٹوٹ گیا تو مدعا دل کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کا تماشا دیکھ رہا ہے دل آئینہ تھا جب وہ ٹوٹا تو بہت سے آئینے پیدا ہوگئے اور آئینہ خانہ بن گیا۔ (مولوی حیدر صاحب)

نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک
آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

قمری کا رنگ خاگی ہوتا ہے اس لئے آسمان کو بیضۂ قمری کہا جس سے ایک مشت خاک کے سوا جس میں وارالمحن بھی کہتے ہیں۔ اور کچھ نہیں ہے۔

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

* * *

روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی
اترائے کیوں نہ خاک سرِ رہگزار کی!
جب اس کے دیکھنے کے لیے آئیں بادشاہ
لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی
بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے
کیوں کر نہ کھایئے کہ ہوا ہے بہار کی

* * *

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہیگا اس کی گردن پر
وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دم بدم نکلے
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے
مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے اور ہم اس کا مضمون معلوم کرلیں کہ لوگ اسے کیا کیا لکھواتے ہیں۔

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے
ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے
محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

○

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جایئے

بے تکلف اے شرارِ جستہ کیا ہو جایئے

شرار سے پوچھتا ہے کہ اگر ہم صدا ہو جائیں گے تو بھی "کوہ کے بار خاطر ہو نگے" پھر ہم کو کیا ہو جلنا چاہیے اور اس انداز سوال سے یہ ظاہر کرتا چاہتا ہے کہ میں بھی شرار کے مانند بے تکلف دم بھر میں جل بجھ کر فنا ہو جانا چاہتا ہوں۔ صبا کا کوہ کے بار خاطر ہونا اس طرح پر نکلتا ہے کہ آواز پہاڑ سے ٹکرا کر واپس چلی آتی ہے۔ پہلے مصرع میں ہوں کے ساتھ ہو جایئے درست نہیں ہے۔

بیضہ آسا ننگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس

از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جایئے

○

مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے

موجِ شراب یک مژۂ خواب ناک ہے

موج شراب کو چشم ساغر کی مژہ خواب آلود قرار دیا اور اس کی خوابناکی کا سبب یہ بتایا کہ مستی شراب کو بھی ساقی کی ادائے تغافل نے مست و بے خود بنا رکھا ہے۔

جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو

جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد!

صحرا ہماری آنکھ میں یک مشتِ خاک ہے

کچھ نظر آتا نہیں یعنی بے حقیقت نظر آتا ہے۔

○

لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

لب عیسیٰ کی جنبش سے مر کے جی اٹھتے ہیں لیکن لب لعل محبوباں کے کشتوں کی نینداس غضب کی ہے کہ اس سے بجائے زندہ ہونے کے ان کی غفلت اور بھی بڑھتی جاتی ہے۔

○

آمدِ سیلاب طوفانِ صدائے آب ہے
نقش پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

نقش پا صورت میں کان ہے اور جادہ بسبب درازی انگلی سے مشابہ ہوتا ہے گویا شور طوفان کی وجہ سے گوش نقش پا نے جادہ کی انگلی دے لی ہے۔

بزمِ مے وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا
شیشہ میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

بزم مے اس کی چشم مست کے اثر سے یکسر وحشت کدہ بن گئی ہے وہاں کی ہر چیز سے وحشت نمودار ہے مثلاً شیشے میں بصورت موج بادہ گویا نبض پری پنہاں ہے۔ موج بادہ کو نبض پری سے مشابہ کر کے وحشت کا اظہار کیا ہے۔

○

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

یعنی میں تمنا اس لئے نہیں کرتا ہوں کہ وہ پوری ہی ہو بلکہ اس لئے کہ دیکھوں اس میں کیا کیفیت ہے۔

○

سیاہی جیسے گر جاوے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

..........☆....... ......

ہجومِ نالہ حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے
خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

حیرت عاجز یعنی عاجز حیرت۔ ہجوم نالہ اس بات سے عاجز ہے کہ حیرت کی وجہ سے آہ و فغاں ناممکن ہے۔ چنانچہ خموشی جو لازم حیرت ہے اس عجز کا اظہار کر رہی ہے۔ خس بدنداں ہونے سے اظہار عجز مراد ہے اور ریشہ نیستاں اس لحاظ سے آیا ہے کہ نیستاں کی بھی بعینہ یہی حالت ہوتی ہے کہ باوجودیکہ اس سے ہزاروں بانسلیاں بن سکتی ہے اور اس لئے اس کو لاکھوں نالہائے ناکشیدہ کا مجمع کہہ سکتے ہیں۔ لیکن بصورت ظاہر ریشہائے نیستاں مشابہ بہ خس ہوتے ہیں۔ اور خموشی نیستاں خس بدنداں نظر آتی ہے۔

تکلف برطرف ہے جاں ستاں تر لطفِ بدخویاں
نگاہِ بے حجابِ ناز تیغِ تیزِ عریاں ہے
ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی
کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے
دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دستِ گرداں ہے

متاع دستگرداں نقد بکا کرتی ہے۔ ساغر کے لئے دستِ گرداں کا لفظ مناسب ہے۔

غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

قلزم صرصر کا مرجان ہے۔ یعنی آغوش بلا میں تربیت پاتا ہے۔ جس طرح مرجان کی پرورش سمندر میں ہوتی ہے۔

○

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے
نگاہ دل سے ترے سرمہ سا نکلتی ہے

تماشا ادا یعنی انداز تماشا دکھانے والی۔ یہاں تماشا ادا نگاہ کی صفت ہے۔ سرمہ کھا لینے سے چونکہ آواز بیٹھ جاتی ہے اس لئے سرمے کو خاموشی سے ایک قسم کا تعلق سمجھ کر غالب نے نگاہ یار کی نسبت کہا کہ وہ دل سے بر بنائے خاموشی سرمہ آلود ہو کر نکلتی ہے۔ واللہ اعلم

فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبنم
صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے

غنچے کو تنگی خلوت کے فشار سے جو پسینہ آجاتا ہے اسی کا نام شبنم ہے۔

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ
کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

جس دروازہ سے وہ جھانکتا ہے اس میں روزن نہ تھا بلکہ تیغ نگاہ نے زخم ڈال دیا ہے اور زخم بھی ایسا گہرا کہ جس میں سے ہوا نکلتی ہے پھر سینۂ عاشق کی کیا حقیقت ہے جس زخم سے ہوا نکلنے اور سانس دینے لگے وہ ضرور مہلک ہوتا ہے (از شرح مولوی علی حیدر صاحب)

○

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے
نافہ دماغ آہوے دشتِ تتار ہے

نسیم بوئے زلف لیکر آہوئے تتار کا دماغ نافہ بن گیا ہے۔

کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا
آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے

دیار انتظار میں ہر طرف آئینے کا فرش کس کے لئے کیا گیا ہے یعنی حیرت کو کس کے جلوے کا انتظار ہے۔

ہے ذرّہ ذرّہ تنگیِ جا سے غبارِ شوق
گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے

تنگی جا کی وجہ سے غبار شوق پس کر اور بھی ذرہ ذرہ ہو گیا ہے کہ ذرے پھیل کر دام بن جائیں گے اور وسعت صحرا اس دام کا شکار ہو گی یعنی وہ دام تمام صحرا پر چھا جائے گا۔

دل مدّعی و دیدہ بنا مدعا علیہ
نظّارہ کا مقدمہ پھر رُوبکار ہے

چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پر آب
اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہے

ایران میں یہ ایک رسم ہے کہ آئینے پر پانی چھڑکتے ہیں۔ تا کہ مسافر بخیریت واپس آ جائے۔

پچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

بے پردہ سوے وادیِ مجنوں گزر نہ کر
ہر ذرہ کے نقاب میں دل بیقرار ہے

اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں
طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی
اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے
غفلت کفیلِ عمر و اسد ضامنِ نشاط
اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

غفلت کی یہ حالت کہ کبھی عمر کے ختم ہونے کا خیال ہی نہیں آتا اور پھر یہ یقین کہ ہمیشہ عیش عشرت ہی میں گزرے گی۔ پس جب ناگہانی تباہی کے یہ اسباب موجود ہیں تو پھر مرگ ناگہاں کو کس بات کا انتظار ہے۔

○

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں
گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

حسرت نے تیری بزم خیال میں (میرے دل میں) ایک گلدستۂ نگاہ لا رکھا جس کو سب سویدا کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سویدا گویا حسرت بھری نگاہوں کا ایک گلدستہ ہے۔

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے
سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے
ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں
شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو
صبحِ بہار پنبۂ مینا کہیں جسے

گلہائے عیش کے کھلنے کے لئے پنبہ مینا صبح بہار کا کام دیتا ہے سپیدی پنبہ کو سپیدی صبح سے مشابہ کیا ہے۔

غالبؔ برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

○

شبنم میں گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے
داغِ دلِ بیدرد نظر گاہِ حیا ہے

گل لالہ پر شبنم کے قطرے نہیں بلکہ عرق شرم ہے۔ لالہ کو شرم اس بات کی ہے کہ اس کے دل میں داغ تو ہے لیکن درد نہیں ہے۔ مذہب عشق میں داغ بے درد کا موجب شرم ہونا مسلم ہے۔

دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار
آئینہ بدستِ بُتِ بدستِ حنا ہے

دل اور آئینے کی رسائی قسمت کا مقابلہ کرتا ہے ایک ہمارا دل ہے جو خوں شدۂ کشمکش حسرت دیدار ہے اور ایک آئینہ ہے جو اس بت بدست حنا کے ہاتھ میں ہے یا یہ کہ دل حسرت دیدار میں خون ہو کر بصورت حنا اس کے ہاتھ میں آئینہ بن گیا ہے۔

شعلہ سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے

افسردگی دل پر جی اس قدر جلا ہے کہ سوزش دل سے بھی اتنا نہ جلتا۔ پس گویا شعلے سے نہ ہوتی۔

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق
آئینہ بہ اندازِ گل آغوش کشا ہے

تیری تصویر میں کس قدر شوخی و خوبی ہے کہ آئینہ اس کے لینے کے لئے گل کے مانند آغوش کھولے ہوئے ہے۔

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

جگر سوختہ کا کوئی نشان سوائے نالہ کے باقی نہیں ہے۔ پہلا مصرعہ بطور تمہید لکھا ہے کہ جس طرح قمری، عشق سرو میں ایک کف خاکستر اور بلبل عشق گل میں صرف رنگ ہی رنگ رہ جاتی ہے اسی طرح ہمارے جگر سوختہ کا کوئی نشان سوائے نالے کے باقی نہیں رہا ہے۔ قفس بمعنی سبد۔

خو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو
معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

بے حوصلگی یہ ہے کہ ہمارا جوش شوق اور وحشت محبوب کو گوارا نہیں ہے۔ حالانکہ معشوقی کا اقتضا یہ تھا کہ وہ ان باتوں کو پسند کرتا۔

مجبوری و دعوائے گرفتاریِ الفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

مصرعہ ثانی مصرعہ اول کی مثال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بحالت مجبوری دعوی محبت ایسا ہی ہے جیسے کسی کا ہاتھ پتھر کے نیچے دبا ہوا ہو اور نکل نہ سکتا ہو لیکن کہنے کو یہ ہو جاوے کہ پیمان وفا نباہا جا رہا ہے۔

معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ
تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے

تیغ ستم کو ایک آئینہ تصویر نما قرار دیا جس میں شہیدان گزشتہ پر جو کچھ جور و ستم گزر گیا ہے اس

کی تصویر پیش نظر ہو جاتی ہے۔

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

جو گناہ ہم سے سرزد ہوئے ہیں۔ ان کی بابت اگر ہم کو سزا دی جاتی ہے تو جو گناہ بسبب عدم قدرت ہم نہیں کر سکے اور جن کی حسرت دل میں رہ گئی ان کی داد بھی ملنی چاہیے؛ داد یہ کہ ان ناکردہ گناہوں کے کرنے کی بھی قدرت عطا ہو۔

بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالبؔ!
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

○

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

تجلی نور کو اپنے اظہار کے لئے تیری شکل منظور تھی۔ یعنی وہ تیری شکل میں ظاہر ہونا چاہتی تھی تیرے قد و رخ سے ظہور کی قسمت کھلی کہ اب ان میں تجلی نور ظاہر ہوئی۔

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی!

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی

لڑتا ہے یعنی اس بات پر کہ ہمارا کشتہ ہو کر آواز صور پر کیوں اٹھا۔

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی
گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی
گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی
غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

○

غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مے گلفام بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

نے تیر کماں میں ہے نہ صیّاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

ہیں اہل خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

اہل خرد رہ و رسم عام کے پابند ہیں پھر کس روش خاص پر ناز کرتے ہیں۔ یعنی کیا اسی کا نام روش خاص ہے۔

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے
آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو
انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

ہو گا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

* * *

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کیے ہوئے

یعنی شرابِ روشن کا ہر ایک جام گویا چراغ تھا۔

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاکِ گریباں کیے ہوئے
پھر گرمِ نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے
پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

یعنی عشق پھر زخمِ دل پر نمک چھڑکنے چلا ہے۔

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

مژگاں کا قلم ہے اور خونِ دل کی روشنائی جس سے صفحۂ دامن پر گلکاریاں ہونگی۔

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پندار بمعنی خودداری یعنی خودداری کو ترک کر کے اب دل پھر کوئے ملامت کو جائے ہے۔

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دل فریبیِ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

◆

نوید امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لیے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے

بیدادِ دوست نے کوئی ستم آسماں کے لیئے باقی نہیں رکھا اس لئے اب جان جورِ آسمان سے بے خوف ہوگئی ہے۔

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کیلیے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لیے

رشک اس بات کا کہ ادا تیری بلا سہی۔ لیکن وہ دوسروں کے لئے بلائے جان بھی کیوں ہے۔

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لیے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا' اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

یعنی پہلے وہ گدا سمجھ کے خاموش تھا۔ لیکن میری جو شامت آئی تو میں اس کے قدموں پر گر پڑا جس سے وہ مجھ کو جان گیا اور مجھے اپنے روبرو نہ رہنے دیا۔

بقدرِ شوق نہیں' ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے
دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے
نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک
بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لیے
زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرایش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

تجمل حسین خاں کے نام میں تجمل کی رعایت سے کہا کہ اس کے زمانہ میں ایک عالم آرائش میں مصروف ہے پس کیا عجب ہے کہ زہرہ و مشتری کی طرح آسمان کے لئے اور ستارے بھی بن جائیں۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے
ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

آغازِ قصائد

قصیدہ اوّل در منقبت

ساز یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار
سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

کہتا ہے کہ فیض چمن سے چمن کا ایک ذرہ بھی بیکار نہیں ہے حتیٰ کہ لالے کا سایہ بھی گویا بہار کے دل کا سویدا ہوتا ہے۔ بیکار نہیں۔

مستیِ بادِ صبا سے ہے بہ عرضِ سبزہ
ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار

کہسار کو تیغ قرار دیا اور سبزہ کہسار کو جوہر تیغ پھر اس جوہر تیغ کی توجیہ اس طرح کی کہ بادصبا کی مستی کے اثر سے سبزہ گویا ریزۂ مینائے مے گیا ہے۔ لطف یہ ہے کہ قلہ کوہ کو تیغ کوہ بھی کہتے ہیں۔

سبز ہے جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ
تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

تاثیر بہار کا ذکر کرتا ہے کہ چیتے کے سیاہ داغ جام زمرد کے مانند سبز ہو گئے ہیں۔ اور شرار ریشہ نارنج کی طرح تازہ ہو گیا۔

مستیِ ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت
کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

مستی ابر سے حسرت بھی طرف اندوز ہو رہی ہے۔ یعنی اس لئے کہ اس کیفیت میں غمہائے دو عالم کا فراموش ہو جانا ممکن ہے۔

کوہ و صحرا ہمہ معموریِ شوقِ بلبل
راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

راہیں جو گویا سوئی ہوئی تھیں یعنی جن پر کسی کا گزر نہ ہوا تھا اب وہ پھولوں کے چٹکنے اور کھلنے سے گویا بیدار ہو گئی ہیں۔ اور کثرت گل کی بنا پر کوہ صحرا بلبلوں کے ہجوم شوق سے معمور ہیں۔

سونپے ہے فیضِ ہوا صورتِ مژگانِ یتیم
سرنوشتِ دو جہاں ابر بیک سطرِ غبار

جس طرح یتیم مژگان خاک آلود سے مدتوں دریائے اشک جاری رہتا ہے اسی طرح فیض ہوا سے آج کل آسمان پر جو ذرا سا بھی غبار نظر آتا ہے اس میں ابر کثیر کی سی قابلیت بارش ہوتی ہے۔

کاٹ کر پھینکیے ناخن تو بہ اندازِ ہلال
قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

قوت نامیہ کا یہ اثر ہے کہ اگر ناخن کاٹکر پھینکا جائے تو وہ ہلال کی طرح بڑھ کر بدر ہو جائے۔

کفِ ہر خاک بگردوں شدہ قمری پرواز
دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار

کہتا ہے کہ بہار نے گویا ہر شے میں جان ڈال دی ہے ہر کف خاک قمری بن گئی ہے اور ہر کاغذ آتش زدہ کا دام طاؤس شکار کرتا ہے۔ یعنی خود بصورت طاؤس ہو جاتا ہے۔ بگردوں شدہ‘ خاک کی صفت ہے اس کو قمری کہا کیونکہ اس کا رنگ بھی خاکی ہوتا ہے کاغذ کو آگ دکھانے سے اس میں بہت سے نقطہائے روشن پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ دام طاؤس سے مشابہ ہوتا ہے۔

میکدے میں ہو اگر آرزوے گل چینی
بھول جا یک قدحِ بادہ بہ طاقِ گلزار

اگر تجھ کو میکدے میں گل چینی کی آرزو ہو تو طاق گلزار میں ایک قدح شراب کا رکھ کر بھول جا۔ نشو نمائے بہار کے اثر سے اس ایک قدح کے ہزاروں قدح ہو جائیں گے اور گلزار میں میکدہ

پیدا ہو جائے گا۔

موجِ گل ڈھونڈ بخلوت کدۂ غنچۂ باغ
گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار

یعنی ہوائے بہار کی تاثیر گوشہ میخانہ کو غنچہ باغ کا خلوت کدہ یعنی گوشہ باغ اور دستار کو موج گل بنا دے گی۔

کھینچے گر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر
سبز مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِ پرکار
لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

سبزہ کوہسار کو طوطی اور پہاڑوں سے جو لعل نکلتا ہے اس کو منقار طوطی قرار دیکر کہتا ہے کہ یہ طوطی سرخ منقار تیری مدحت سرائی کے لئے پیدا ہوئی ہے۔

وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیر سرا
چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار
فلک العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور
رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار

اس قصر کی تعمیر کے لئے عرش گویا دوش مزدور کا خم ہے۔ اور رشتہ فیض ازل گویا معمار کی ڈوری ہے جس سے وہ دیوار کی کجی و راستی کا اندازہ کرتا ہے۔

سبزۂ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام
رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار

یعنی ممدوح کی پشت لب بام کا ایک خط سبزۂ نہ چمن کے برابر ہے اور اس کا حصار عارفوں کی

ہمت کے برابر بلند ہے سبزیٔ نہ چمن کا استعارہ تو آسمانوں سے ہے اور حرف عطف دونوں مصرعوں میں مساوات کے لئے ہے۔

دل کی خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِکاہ
وہ رہے مَروحۂ بالِ پری سے بیزار
خاکِ صحرائے نجف جوہرِ سیرِ عُرفا
چشمِ نقشِ قدم آئینۂ بختِ بیدار

بحالت زیارت نجف صحرائے نجف کی خاک عارفوں کی سیر کا جوہر ہوتی ہے اور اس خاک پر جو نقش قدم پیدا ہوتے ہیں جس میں بخت بیدار کی صورت نظر آتی ہے۔

ذرہ اس گرد کا خورشید کو آئینہ ناز
گرد اس دشت کی امید کو احرامِ بہار

گرد نجف کا ہر ذرہ آفتاب کے لئے آئینہ ناز ہے اور دشت نجف کی گرد نسبت نجف کی وجہ سے امید کے لئے فصل بہار کا جامۂ احرام ہے۔

آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیِ ناز
عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غبار

ایجاد کو اس خاک پاک کی آفرینش پر ناز ہے۔ پس نجف کی ہر موج غبار گویا آفرینش و ایجاد کی انگڑائی ہے جس کے ذریعہ وہ بہ زبان حال یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم کو اس شراب فخر و ناز (یعنی ناز ایجاد نجف) کی پھر خواہش ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس سرزمین کو پیدا کر کے آفرینش کو بار بار ناز ہوتا ہے۔

مطلع ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار
دلِ پروانہ چراغاں، پرِ بلبل گلزار

تیرے فیض نے پروانے کے دل کو چراغاں اور بلبل کے پروں کو گلزار بنا دیا ہے۔ یعنی ہر ایک کے مقاصد حاصل ہو گئے ہیں۔

شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز
ذوق میں جلوہ کے تیرے بہ ہوائے دیدار

یعنی آئینہ خانہ تیرے جلوے کے ذوق اور تیرے دیدار کی خواہش میں مثل طاؤس پرواز کرتا ہے۔

تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں
سلکِ اختر میں مہِ نو مژہ گوہر بار

حسنین علیہما السلام کے غم میں مہ نو کو مژہ اور ستاروں کو سلک اشک قرار دیا۔

ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم مہرِ نماز
ہم ریاضت کو ترے حوصلہ سے استظہار

تیرا نقش پا عبادت کے لئے سجدہ گاہ ہے اور ریاضت کو تیرے حوصلے کی مثال سے تقویت پہونچتی ہے۔

مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعتِ نبی
جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار
جوہرِ دستِ دعا آئینہ یعنی تاثیر
یک طرف نازشِ مژگاں و دگر سو غمِ خار

دست دعا کو آئینہ او تاثیر کو اس آئینہ کا جوہر قرار دیکر کہتا ہے کہ یہ تاثیر دعا مژگان خون فشاں کے لئے مایۂ نازش ہے اور خار حسرت کے لئے موجب ملال۔ مطلب یہ ہے کہ تیری دعا ہمیشہ قبول ہوتی ہے اور اس لئے اس کی تاثیر مژگان کے لئے جو قبولیت دعا کے لئے خوں فشاں رہتی ہے باعث ناز اور خار غم کے لئے موجب ملال ہے۔

مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبال نگاہ
خاکِ در کی ترے جو چشم نہ ہو آئینہ دار

جو آنکھ تیرے خاک در کی آئینہ دار نہ ہو وہ اقبال نگاہ کا عزا خانہ ہو جائے۔

دشمنِ آلِ نبی کو بہ طرب خانۂ دہر
عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو طاقِ دیوار

دشمن آل نبی کے حق میں طرب خانہ دھر کا ہر طاق دیوار عرض خمیازہ سیلاب ہو جائے یعنی کبھی اس کو خرمی نصیب نہ ہو۔ طاق میں جو خم ہوتا ہے اس کی بنا پر اسے خمیازہ سیلاب سے مشابہ کیا ہے۔

دیدہ تا دل اسدؔ آئینۂ یک پرتوِ شوق
فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

آنکھ سے لیکر دل تک ایک پرتو شوق کا آئینہ ہے فیض معنی سے راقم حروف کا ساغر سرشار ہے۔ یعنی میں ہمہ تن شوق ہوں اور فیض منقبت علی سے میری تحریر لبریز ہے۔

قصیدہ

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

مسئلہ وحدت وجود کی بنا پر کہتا ہے کہ دنیا کی ہر شے میں جلوہ حق نمودار ہے اگر اس کو اپنا جلوہ خود دیکھنا منظور نہ ہوتا تو کوئی چیز ظہور میں نہ آتی۔

بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

تماشے یعنی نظارے کی نسبت کہتا ہے کہ وہ اس بے دلی کے ساتھ کیا گیا کہ نہ اس سے ذوق حاصل ہوا نہ عبرت علی ہذا القیاس تمنا کی بیکسی کی نسبت افسوس کرتا ہے کہ وہ نہ دنیا کے متعلق ہے نہ دیں کے۔

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم
لغو ہے آینۂ فرقِ جنون و تمکیں

وجود باری تعالیٰ کے سوا اشیا کے وجود و عدم کی نسبت یا جنون و تمکین کے فرق کے متعلق گفتگو کرنا فضول ہے۔

نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت
سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں

نقش معنی گویا عرض صورت کا خمیازہ ہے اور سخن حق گویا ذوق تحسین کا پیمانہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ بظاہر ''معنی'' کے درپے ہیں وہ درحقیقت اظہار صورت کے خواہشمند ہیں یعنی آج کل معنی شناسی صورت شناسی سے زیادہ نہیں ہے علی ہذا القیاس جو لوگ امر حق کے اظہار میں بیباک نظر آتے ہیں ان کا مطلب بھی صرف یہ ہوتا ہے کہ اس باب میں لوگ ان کی تعریف کریں۔

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

معاملات دنیا میں دعوائے دانش غلط ہے اور امور دین میں نفع عبادت کی امید فضول۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا و دیں دونوں ایک ساغر غفلت کی درد ہیں۔

مثلِ مضمونِ وفا باد بدستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدم خاک بفرقِ تمکیں

دنیا کی ہجو کرتا ہے کہ یہاں تسلیم و رضا سے اسی طرح کچھ فائدہ نہیں ہوتا جس طرح وفا سے اور تمکین کو اسی طرح سے ذلت ہوتی ہے جس طرح نقش قدم خاک بسر ہوتا ہے۔

عشق بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس
وصل زنگارِ رُخِ آینۂ حسنِ یقیں

اختلال حواس کا نام عشق ہے اور وصل زنگار ہے حسن یقین کے آئینے کا یعنی اگر یقین کامل ہوتا تو وصل ظاہر کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

کوہکن گر سنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بیستوں آینۂ خواب گرانِ شیریں

کوہکن کی نسبت کہتا ہے کہ اپنے رقیب خسرو کی عشرت گاہ کا مزدور تھا یعنی کچھ نہ تھا اور کوہ بے ستون تغافل شیریں کی تصویر تھا۔

کس نے دیکھا نفسِ اہل جہاں ہوں لیکن
نہ سرو برگِ ستائش نہ دماغِ نفریں
کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ
یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں
نقش لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر
یاعلی عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں

یعنی دفع وسواس کے لئے یاعلی کا ورد کر اور لاحول کا نقش لکھ۔ یہاں نقش سے تعویز مراد ہے مثلاً ۱۵ کا نقش ۲۱ کا نقش۔

مظہرِ فیضِ خدا جان و دلِ ختمِ رسل
قبلۂ آلِ نبیؐ کعبۂ ایجادِ یقیں

ہو وہ سرمایۂ ایجاد جہاں گرمِ خرام
ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں

ایجاد کی رعایت سے کہتا ہے کہ وہ سرمایۂ ایجاد جہاں خرام کرے وہاں کی ایک مشت خاک سے کرہ زمین بن سکتا ہے۔

جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اس کا جس جا
وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں
نسبتِ نام سے اس کی ہے یہ رتبہ کہ رہے
ابداً پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں

ابوتراب کنیت حضرت علی کرم اللہ وجہہ میں لفظ تراب موجود ہے جس کے معنی خاک کے ہیں اور زمین کو خاک سے نسبت ہے پس غالب کہتا ہے کہ اسی نسبت نام کے باعث زمین کے آگے پشت فلک ہمیشہ خم رہتی ہے۔

فیضِ خلق اس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا
بوئے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں
بُرشِ تیغ کا اس کی ہے جہاں میں چرچا
قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

اس کی برش تیغ کے شہرۂ عام سے خوف ہوتا ہے۔ کہ کہیں سر رشتۂ ایجاد آفرینش ہی نہ قطع ہو جائے۔

کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بت خانۂ چیں

اس کا جلوہ ایسا کفر کا مٹانے والا ہے جس سے بتخانہ چین کی رونق رنگ عاشق کی طرح اڑ جائے رنگ کا ٹوٹنا اور رونق کا ٹوٹنا فارسی محاوروں کے ترجمے ہیں۔

جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا!
وصیِ ختمِ رسل تو ہے بہ فتوائے یقیں

دل و جاں فیض رسانا یعنی اے فیض رسان دل و جان۔

جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبرؐ منبر
نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں
کس سے ممکن ہے تری مدح' بغیر از واجب؟
شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں

یعنی خدا کے سوا اور کسی سے تیری مدح نہیں ہو سکتی شمع کی زینت اور آئین بندی شعلہ شمع کے سوا اور کون کر سکتا ہے۔

آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ
رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریلِ امیں

سنگ آستان ممدوح کو آئینہ قرار دیا ہے اور اس سنگ در پر حضرت جبریل کی جبیں سائی کے جو نشان ہیں ان کو اس آئینے کا جوہر ٹھیرایا ہے۔

تیرے در کے لیے اسبابِ نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں
تیری مدحت کے لیے ہیں دل و جاں' کام و زباں
تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم' دست و جبیں
کس سے ہو سکتی ہے مدّاحیِ ممدوحِ خدا!
کس سے ہو سکتی ہے آرایشِ فردوسِ بریں!

جنسِ بازارِ معاصی اسد اللہ اسدؔ
کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں
شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخِ طلب
ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بسکہ یقیں
دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسنِ قبول
کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار 'آمیں'
غمِ شبیّر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں
طبع کو الفتِ دلدل میں یہ سرگرمیِ شوق
کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبیں
دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا
نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں

''الفت نسب'' دل کی صفت ہے یعنی ایسا دل جس کو الفت سے نسبت ہو علی ہذا القیاس، سینہ توحید فضا یعنی ایسا سینہ جس کی فضا توحید ہو یعنی توحید سے معمور ہو۔

صرفِ اعدا اثرِ شعلۂ دودِ دوزخ
وقفِ احباب، گل و سنبلِ فردوسِ بریں

قصیدہ

ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح
یہی انداز اور یہی اندام

ہر مہینے میں چاند دو دن چھپا کرتا ہے اور تیسرے روز پھر نکلا کرتا ہے۔ مثلاً اگر چھبیسویں تاریخ کو چھپتا ہے تو اٹھیسویں کو اور ستائیسویں کو چھپتا ہے تو پھر تیسویں تاریخ کو نکلتا ہے۔ چنانچہ اسی لحاظ سے اکثر لوگ رمضان کی ۲۶ اور ۲۷ تاریخ کو بوقت صبح چاند دیکھا کرتے ہیں اور ان دونوں تاریخوں کا چاند بہت باریک ہوتا ہے۔

بارے دو دن کہاں رہا غائب؟
"بندہ عاجز ہے" گردشِ ایام
اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص
حبّذا اے نشاطِ عامِ عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا
صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور ترا انجام
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام؟

جانتا ہوں کہ آج دنیا میں
ایک ہی ہے امید گاہِ اَنام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالبؔ اس کا مگر نہیں ہے غلام
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
تب کہا ہے بطرزِ استفہام

“تب کہا ہے بطرزِ استفہام” یعنی بطور استفہام انکاری اس طرح پر پوچھا ہے کہ “کیا غالبؔ اس کا غلام نہیں ہے۔” یعنی یہ جانتا ہے کہ غالبؔ بھی ممدوح کا غلام ہے۔

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ
قربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام
تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا
جُز بتقریبِ عیدِ ماہِ صیام
جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
ماہ بن ماہتاب بن میں کون؟
مجھ کو کیا بانٹ دیگا تو انعام
میرا اپنا جدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام؟

ہے مجھے آرزوے بخششِ خاص
گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام
جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِ فروغ
کیا نہ دیگا مجھے مے گلفام!
جب کہ چودہ منازلِ فلکی
کر چکے قطع تیری تیزیِ گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر
کوے و مشکوے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا اک بلوریں جام
پھر غزل کی روش پہ چل نکلا
توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام
تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام؟

یعنی زہر غم سے میرا کام یوں نہیں تمام ہو جاتا تو نے ناحق اپنے سر میرے قتل کا الزام لیا۔

مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں؟
غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام
بوسہ کیسا؟ یہی غنیمت ہے
کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام

یعنی اگر وہ یہ جان جائیں گے کہ مجھ کو دشنام میں بھی لذت ملتی ہے تو گالی دینا بھی موقوف کر

دیں گے۔

کعبہ میں جا بجائیں گے ناقوس
اب تو باندھا ہے دیر میں احرام
اس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد
چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ وام
بوسہ دینے میں ان کو ہے انکار
دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام
چھیڑتا ہوں کہ ان کو غصہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالبؔ اپنا نام

* * *

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ
اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن
نامِ شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
مظہرِ ذوالجلالِ والاکرام

شہسوارِ طریقۂ انصاف
نوبہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز
جس کا ہر قول معنیِ الہام
بزم میں میزبانِ قیصر و جم
رزم میں اوستادِ رستم و سام
اے ترا لُطف زندگی افزا
اے ترا عہد فرخی فرجام
چشمِ بددور خسروانہ شکوہ
لُوحَشِ اللہ عارفانہ کلام
جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم
جُرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام
وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے
ایرج و تور و خسرو و بہرام
زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے
گیو و گودرز و بیژن و رہام
مرحبا! موشگافیِ ناوک
آفریں! آب داریِ صمصام

تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف
تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام

پہلے مصرع میں ممدوح کے تیر کی موشگافی کا ذکر کرتا ہے کہ وہ تیر تیرِ دشمن کو اپنا نشانہ بناتا ہے اور دوسرے مصرع میں آبداری تیغ کا حال لکھتا ہے کہ وہ تیغ تیغِ دشمن کو کاٹ ڈالتی ہے۔

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند!
برق کو دے رہا ہے کیا الزام!

ق

تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا
تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام
فنِ صورتگری میں تیرا گرز
گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام
اس کے مضروب کے سر و تن سے
کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے
صفحہ ہائے لیالی و ایام
اور ان اوراق میں بکلکِ قضا
مجملاً مندرج ہوئے احکام
لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کش
لکھ دیا عاشقوں کو دشمنِ کام

آسماں کو کہا گیا کہ کہیں
گنبدِ تیز گردِ نیلی فام
حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں
خال کو دانہ اور زلف کو دام
آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضعِ سوز و نم و رم و آرام

لف ونشر مرتب ہے یعنی آتش کے لئے سوز۔ آب کے لئے نم۔ باد کے لئے رم اور خاک کے لئے آرام آیا ہے۔

مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز
ماہِ تاباں کا اسم شحنۂ شام
تیری توقیعِ سلطنت کو بھی
دی بدستور صورتِ ارقام
کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم
اس رقم کو دیا طرازِ دوام
ہے ازل سے روائیِ آغاز
ہو ابد تک رسائیِ انجام

قصیدہ

صبحدم دروازۂ خاور کھلا
مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا

خسروِ انجم کے آیا صرف میں
شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

خسرو انجم سے مراد آفتاب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آفتاب کے نور میں ستارے چھپ گئے گویا خسرو انجم نے گنجینۂ گوہر کو صرف کر ڈالا۔

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود
صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو
موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر
اک نگارِ آتشیں رُخ، سر کھلا
تھی نظر بندی، کیا جب ردِ سحر
بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا
لا کے ساقی نے صبوحی کے لیے
رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا
بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

تاجِ زرّیں مہرِ تاباں سے سوا
خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا
شاہِ روشن دل بہادر شہ کہ ہے
رازِ ہستی اس پہ سر تا سر کھلا
وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں
مقصدِ نُہ چرخ و ہفت اختر کھلا
وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے
عقدۂ احکامِ پیغمبرؐ کھلا
پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام
اس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا
روشناسوں کی جہاں فہرست ہے
واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا
توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب
تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا

ق

نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب
تو کہے بت خانۂ آزر کھلا
مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے
منصبِ مہر و مہ و محور کھلا

لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک
میری حدِ وسع سے باہر کھلا
تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید
کس نے کھولا کب کھلا کیونکر کھلا
باغِ معنی کی دکھاؤنگا بہار
مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا
ہو جہاں گرمِ غزلخوانی نفس
لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

غزل

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا
کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا
ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پاویں گر کھلا
ہم کو ہے اس راز داری پر گھمنڈ
دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا
واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا
ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کمان
کب کمر سے غمزہ کی خنجر کھلا

مفت کا کس کو برا ہے بُدرقہ
رہروی میں پردۂ رہبر کھلا
سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک
آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا
نامہ کے ساتھ آ گیا پیغامِ مرگ
رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا
دیکھیو غالبؔ سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا
پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال
پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا
خامے نے پائی طبیعت سے مدد
بادباں بھی اٹھتے ہی لنگر کھلا

قلم کو لنگر سے تشبیہ دی اور طبیعت کو بادباں سے یعنی جس وقت قلم رواں ہوا۔ طبیعت بھی کھل گئی۔

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ
یاں عَرَض سے رُتبۂ جوہر کھلا

مدح عرض ہے اور ممدوح جوہر یہاں مدح سے ممدوح کے شکوہ کا حال معلوم ہو گیا گویا عرض سے جوہر کا رتبہ کھلا۔

مہر کانپا، چرخ چکر کھا گیا
بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب
اب عُلوِ پایۂ منبر کھلا
سکّۂ شہ کا ہوا ہے روشناس
اب عیارِ آبروئے زر کھلا
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ
اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا

یعنی ایجادِ آئینہ سے سکندر کی یہی غرض تھی کہ ممدوح کی آئینہ داری کی عزت حاصل کرے۔

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے
اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا
ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے
دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا
فکر اچھی پر ستایش ناتمام
عجزِ اعجازِ ستایش گر کھلا
جانتا ہوں ہے خطِ لوحِ ازل
تم پہ اے خاقانِ نام آور کھلا
تم کرو صاحبقرانی جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

در صفت انبہ

ہاں دلِ درد مند زمزمہ ساز
کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز!
خامے کا صفحہ پر رواں ہونا
شاخِ گل کا ہے گلفشاں ہونا

مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے
نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے
بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ نخلِ رُطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میداں ہے
ثمَر و شاخ گوے و چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں
آئے یہ گوے اور یہ میداں
آم کے آگے پیش جاوے خاک
پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدور
بادۂ ناب بن گیا انگور
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے
شرم سے پانی پانی ہونا ہے
مجھ سے پوچھو تمھیں خبر کیا ہے
آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار
جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار
اور دوڑائیے قیاس کہاں
جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں

جان میں ہوتی گر یہ شیرینی
کوہکن باوجودِ غمگینی
جان دینے میں اس کو یکتا جان
پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان
نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر
کہ دواخانۂ ازل میں مگر
آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام
شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام
یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے
باغبانوں نے باغِ جنت سے
انگبیں کے بہ حکمِ ربُّ الناس
بھر کے بھیجے ہیں سر بمُہر گلاس
یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات
مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات
تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل
ہم کہاں۔ ورنہ اور کہاں یہ نخل
تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس
رنگ کا زرد پر کہاں بو باس

آم کو دیکھتا اگر اک بار
پھینک دیتا طلائے دستِ افشار
رونقِ کار گاہِ برگ و نوا
نازشِ دودمانِ آب و ہوا
رہروِ راہِ خلد کا توشہ
طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ
صاحب شاخ و برگ و بار ہے آم
ناز پروردۂ بہار ہے آم
خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو
نو برِ نخلِ باغِ سلطاں ہو
وہ کہ ہے والیِ ولایتِ عہد
عدل سے اس کے ہے حمایتِ عہد
فخرِ دیں عزِّ شان و جاہ و جلال
زینتِ طینت و جمالِ کمال
کار فرمائے دین و دولت و بخت
چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت
سایہ اس کا ہما کا سایہ ہے
خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے

اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور
جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور
اس خداوندِ بندہ پرور کو
وارثِ گنج و تخت و افسر کو
شاد و دلشاد و شادماں رکھیو
اور غالبؔ پہ مہرباں رکھیو

قطعات

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر
اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل
پانو سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ
فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل

تخت تیرے قدموں سے اپنا سر ارادت ملتا ہے اور تاج تیرے سر سے کسب سعادت کرتا ہے۔

تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل

تیرا اندازِ سخن الہام کی زلف کا شانہ ہے یعنی وہ الہامی دقائق کو سلجھا دیتا ہے۔

تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم
تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل

تجھ کو قربِ کلیم و بذلِ خلیل دونوں حاصل ہیں۔

بہ سخن اوج دہ مرتبۂ معنی و لفظ
بہ کرم داغ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل

تیرے کلام سے معنی ولفظ کا مرتبہ بلند ہوتا ہے اور تیرے کرم سے قلزم ونیل شرمندہ ہیں۔

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر
تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل
ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر
زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

ماہ کا برج ثور میں اور زہرہ کا برج حوت میں ہونا مبارک ہوتا ہے پس غالب کہتا ہے کہ اس غرض سے کہ تیرے عہد میں ہمیشہ عیش وعشرت قائم رہے ماہ وزہرہ نے ثور وحوت میں مستقل طور پر قیام کرلیا ہے۔

تیری دانش مری اصلاحِ مفاسد کی رہین
تیری بخشش مرے انجاحِ مقاصد کی کفیل
تیرا اقبالِ ترحّم مرے جینے کی نوید
تیرا اندازِ تغافُل مرے مرنے کی دلیل
بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں
چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل
پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

یعنی جب ناخن تدبیر کو کیل ٹھونک کر بیکار کر دیا تب میرے سررشتۂ اوقات میں گرہ ڈالی کہ کسی طرح کھل ہی نہ سکے۔

تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم
کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل

یعنی تپش دل میرے لئے موجب خوف عظیم ہے اور سانس لینا جرثقیل سے کم نہیں۔

درِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی
غمِ گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل

مشہور ہے کہ لقا کی ڈاڑھی کے ہر ہر بال میں موتی پرو دیے گئے تھے اور عمرو عیار کی زنبیل کی نسبت تو سب جانتے ہیں کہ جو کچھ اس میں پڑتا تھا غائب ہو جاتا تھا اور وہ کبھی پر نہ ہوتی تھی غالب نے عمرو کے بجائے ''امر'' شائد بلحاظ ادب لکھا ہے یعنی وہ اس خیال سے کہ عمرو عیار جو ایک فرضی نام ہے اس میں اور حضرت عمرا ابن امیہؓ صحابی کے نام میں خلط ملط نہ ہو جائے۔

فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

یعنی گویا میری عبارت قلیل ہے لیکن اس میں معانی اور اشارات کثیر ہیں۔

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل
نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل
قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

○

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے

''تقریر کردن'' فارسی محاورے کا ترجمہ ہے۔ ''غیروں کی وفاداری تقریر کیا کرتے تھے'' یعنی

بیان کرتے تھے۔

بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو، مل جاؤ
قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں، کیوں ہم نہ کہتے تھے

○

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرّا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازۂ شیریں کہ واہ واہ
وہ باد ہائے نابِ گوارا کہ ہائے ہائے

☆

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے
مہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے
حرزِ بازوے شگرفانِ خود آرا کہیے

مستی آلودہ سر انگشتِ حسیناں لکھیے
داغِ طُرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے
سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے
خالِ مشکینِ رُخِ دلکشِ لیلیٰ کہیے
حَجَرُالاسودِ دیوارِ حرم کیجے فرض
نافۂ آہوے بیابانِ خُتن کا کہیے
وضع میں اس کو اگر سمجھیے قافِ تریاق
رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے
صومعے میں اسے ٹھیرایئے گر مہرِ نماز
میکدے میں اسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے
کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے
کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیے
کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجے
کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے
کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلیٰ لکھیے
کیوں اسے نقشِ پےِ ناقۂ سلمیٰ کہیے

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

قطعہ

نہ پوچھ اس کی حقیقت، حضورِ والا نے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

○

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پُشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے
آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفرؔ کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا
جُز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا ز رہِ امتثال امر
دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

یہ اشارا سہرے کے اس مقطع کی جانب ہے۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھ کر سہرا

جس کو سن کر بہادر شاہ کو خیال ہوا کہ مرزا نے ذوق پر چوٹ کی ہے چنانچہ یہ قطع غالب نے بادشاہ کی رفع بدگمانی ہی کی غرض سے لکھا تھا۔

رُوے سخن کِسی کی طرف ہو تو رُوسیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں، غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

○

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حُسنِ دل افروز کا زیور سہرا
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طُرفِ کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا
ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہونگے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
سات دریا کے فراہم کیے ہونگے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
رخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہر بار سراسر سہرا
یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا
جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا
جب کہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا
تارِ ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گرانباریِ گوہر سہرا
ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرف دار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

◆

نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے
گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
رونقِ بزمِ مہ و مہر تری ذات سے ہے
اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے
خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سرِ دست
نسبت اک گونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے
ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عناں
یہ دعا شام و سحر قاضیِ حاجات سے ہے
تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

اس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار
غالبِ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

متفرقات

○

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو
رکھ دیں چمن میں بھر کے مے مشک بو کی ناند
جو آئے جام بھر کے پیے اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند
غالبؔ یہ کیا بیاں ہے بجز مدحِ بادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت خواند
بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زرِ مہر و ماہ ماند
یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بیشمار چاند

در مدحِ شاہ

اے شاہِ جہانگیر جہاں بخش جہاندار
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو۔
تو وا کرے اس عقدے کو سو بھی بہ اشارت
ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

یعنی یہ ممکن نہیں کہ خضر بغیر چشمۂ حیواں سے لب کو پاک کئے ہوئے سکندر سے تیرا ذکر کرے۔

آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخر سلیماں جو کرے تیری وزارت
ہے نقشِ مریدی ترا فرمانِ الٰہی
ہے داغِ غلامی ترا توقیعِ امارت

یعنی تیرے ساتھ ارادت گویا خدا کا حکم بجالانا ہے اور تیری غلامی امارت سے بڑھ کر ہے۔

تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں
تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت
ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت
ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل
ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت
کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر
قاصر ہے ستایش میں تری میری عبارت

نو روز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
نظّارگیِ صنعتِ حق اہلِ بصارت
تجھ کو شرفِ مہرِ جہانتاب مبارک
غالبؔ کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

قطعہ

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

گزارش مصنف بحضور شاہ

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ
اے جہاندارِ آفتاب آثار
تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں
تھا میں اک درد مندِ سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی
ہوئی میری وہ گرمیِ بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز
روشناسِ ثوابت و سیّار
گرچہ ازروئے ننگِ بے ہنری
ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں
بادشہ کا غلامِ کار گزار
خانہ زاد اور مرید اور مداح
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر
نسبتیں ہو گئیں مشخص چار
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں
مدعائے ضروری الاظہار
پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں
ذوقِ آرائش سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر
تا نہ دے بادِ زمہریر آزار
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش
جسم رکھتا ہوں' ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال
کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انساں
دھوپ کھاوے کہاں تلک جاندار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی
وَقِنا رَبَّنا عَذابُ النار
میری تنخواہ جو مقرر ہے
اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا
ہو گیا ہے شریک ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغز گوے خوش گفتار

رزم کی داستان گر سنیے
ہے زباں میری تیغِ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے
ہے قلم میری ابرِ گوہر بار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری سے نہیں مجھے سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعات

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے
کہ جو شریک ہو میرا شریکِ غالب ہے

○

سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آ پڑی
مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے

یعنی کل بارہ روز کی رخصت مانگی ہے۔

تین دن مسہل سے پہلے، تین دن مسہل کے بعد
تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے؟

○

خجستہ انجمنِ طوے میرزا جعفر
کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالبؔ
نہ کیوں ہو مادۂ سالِ عیسوی "محظوظ"

(۱۸۵۴ء)

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی
ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید
کہا غالبؔ سے تاریخ اس کی کیا ہے؟
تو بولا "انشراحِ جشنِ جمشید"

۱۲۷۰ھ

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں
دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں

یہ دربار شاہی کا ایک قاعدہ تھا کہ بادشاہ کے سوا کسی کو سلام کرنا ہوتا تھا تو بجائے پیشانی پر ہاتھ رکھنے کے کانوں کی جانب ہاتھ لے جاتے تھے۔

کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام
اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

رباعی

بعد از اتمامِ بزمِ عیدِ اطفال
ایامِ جوانی رہے ساغر کشِ حال
آ پہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم
اے عمرِ گزشتہ یک قدم استقبال

○

شب زلف و رخِ عرق فشاں کا غم تھا
کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک
ہر قطرۂ اشک دیدۂ پرنم تھا

زلف وروئے یار کی یاد میں جو آنسو نکلے اس میں زلف ورخ کی سیاہی اور سپیدی کے اثر سے آنکھ کی سی کیفیت پیدا ہوگئی پس میں گویا ہزار آنکھ سے رویا۔

◆

آتشبازی ہے جیسے شغلِ اطفال
ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی
لڑکوں کے لیے گیا ہے کیا کھیل نکال!

موجد عشق نے اطفال حسین کے لیے اچھا کھیل نکالا ہے کہ عشاق کی سوز جگر کا آتشبازی کے طور پر تماشا دیکھتے ہیں۔

◆

دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی
بیتابیِ رشک و حسرتِ دید سہی
ہم اور فسردن اے تجلّی افسوس!
تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

دردتمہید' جان کی صفت ہے' یعنی کیسی جان جس کی تمہید درد سے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک ہمارے پاس دل تھا۔ اس وقت تک ہم نے رنج والم رشک وحسرت سب ہی کچھ برداشت کیا لیکن اب تو ہم ہیں اور افسردگی پس ایسی حالت میں اے تجلی یار اگر تکرار ممکن نہیں ہے تو تجدید ہی سہی بہرحال کسی طرح سے اس سوز ساز اور رشک وحسرت کی لذت پھر حاصل ہو۔

◆

ہے خلقِ حسد قماش لڑنے کے لیے
وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لیے
یعنی ہر بار صورتِ کاغذِ باد
ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لیے

◆

دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا
اس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتا ہی نہیں
غالبؔ منہ بند ہو گیا ہے گویا

◆

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ!
دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ!
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں!
سونا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ!

◆

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل!
سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

◆

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جم جاہ نے دال
ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال

یہ شاہ پسند دال بے بحث وجدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

○

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم
آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم
ہے اب کی شبِ قدر و دوالی باہم

○

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے
تاشاہ شیوعِ دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ
ہے صفر کہ افزایشِ اعداد کرے

○

اس رشتے میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا
اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا
ہر سیکڑہ کو ایک گرہ فرض کریں
ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

○

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں
عُشاق کی پرسش سے اسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا
کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

ہاتھ اٹھانا ایک معمولی معنوں میں مستعمل ہے مثلاً مارنے کے لئے ہاتھ اٹھانا اور ایک ترک کرنے کے معنوں میں مثلاً ظلم سے ہاتھ اٹھانا۔ یہاں ان دونوں معنوں پر غور کرنے سے مضمون کا لطف دریافت ہوسکتا ہے۔

○

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ!
وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

وہ یعنی خدا خود بھی صبح و شام کیا کرتا ہے۔ صبح و شام کرنا ٹالنے کے معنوں میں مستعمل ہے۔

○

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالب! لیکن
خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

ضمیمہ

غزل

لُطفِ نظّارۂ قاتل دمِ بسمل آئے
جان جائے تو بلا سے پہ کہیں دل آئے
ان کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گزری
دوست جو ساتھ مرے تالبِ ساحل آئے
وہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حرم کو اے شیخ
ساتھ حجّاج کے اکثر کئی منزل آئے
دیدہ خونبار ہے مدت سے و لے آج ندیم
دل کو ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے
سامنا حور و پری نے نہ کیا ہے نہ کریں
عکس تیرا ہی مگر تیرے مقابل آئے
اب ہے دلی کی طرف کوچ ہمارا غالب
آج ہم حضرتِ نواب سے بھی مل آئے

اس ضمیمہ میں وہ غزلیں اور اشعار ہیں جو راقم حروف کو مختلف ذرائع سے حاصل ہوئے ہیں اور جو مطبوعہ دیوانِ غالب میں موجود نہیں۔ حسرت

غزل دیگر

میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی
تم ہو بت پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے
تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی
ہم سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

☆

جاتا ہوں جدھر اٹھتی ہے بس کی ادھر انگشت
یکدستِ جہاں مجھ سے پھرا ہے مگر انگشت

☆

کس قدر خاک ہوا ہے دلِ مجنوں یارب
نقشِ ہر ذرہ سویدائے بیاباں نکلا

☆

برہمن شرم ہے باوصفِ شوخی اہتمام اس کا
نگیں میں جوں شرارِ سنگ ناپیدا ہے نام آسکا
مسی آلودہ ہے مہرِ نوازش نامہ ظاہر ہے
کہ داغِ آرزوئے بوسہ دیتا ہے پیام اسکا

بامیدِ نگاہِ خاص ہوں محمل کشِ حسرت
مبادا ہو عناں گیرِ تغافل لطفِ عام اس کا

* * *

شب کو ذوقِ گفتگو سے تیرے دل بیتاب تھا
شوخیِ وحشت سے افسانہ فسونِ خواب تھا
واں ہجومِ نغمہائے سازِ عشرت تھا اسد
ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا

○

دود کو آج اس کے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی
وہ دلِ سوزاں کہ کل تک شمعِ ماتم خانہ تھا
شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا
غالب ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

○

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہوا داروں کا

○

معزولیِ تپش ہوئی افراطِ انتظار
چشمِ کشودہ حلقۂ بیرونِ در ہے آج

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

○

مے کشی کو نہ سمجھ بے حاصل
بادہ غالبؔ عرقِ بید نہیں

○

ہے نزاکت بسکہ فصلِ گل میں معمارِ چمن
قالبِ گل میں ڈھلی ہے خشتِ دیوارِ چمن

○

ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشاں
خارِ الم سے پشت بدنداں گزیدہ ہوں
ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

○

ابر روتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو
برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو

○

ہندوستان سایۂ گل پائے تخت تھا
جاہ و جلالِ عہدِ وصالِ بتاں نہ پوچھ
ہر داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے
عرضِ فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ

کہتا تھا کل وہ محرمِ راز اپنے سے کہ آہ
دردِ جدائیِ اسد اللہ خاں نہ پوچھ

○

ہجومِ ریزشِ خوں کے سبب رنگ اڑ نہیں سکتا
حنائے پنجۂ صیّاد مرغِ رشتہ بر پا ہے

○

غالب زبسکہ سوکھ گئے چشم میں سرشک
آنسو کی بوند گوہرِ نایاب ہو گئی

○

بہا ہے یاں تک اشکوں میں غبارِ کلفتِ خاطر
کہ چشمِ تر میں ہر اک پارۂ دل پائے در گل ہے

○

کمالِ حسن اگر موقوفِ اندازِ تغافل ہو
تکلف برطرف تجھ سے تری تصویر بہتر ہے

○

حیراں ہوں شوخیِ رگِ یاقوت دیکھ کر
یاں ہے کہ صحبتِ خس و آتش برابر ہے

قاضی القضاۃ کلکتہ مولوی سراج الدین علیخان موجد موہانی کی فرمائش سے مرزا نے اپنے دیوان اردو فارسی کا خود انتخاب کر کے اس کا نام ”گلِ رعنا“ رکھا تھا۔ راقم کے پاس اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ چنانچہ یہ اشعارِ ضمیمہ اسی سے نقل کیے گئے ہیں۔ ”حسرت“

عبارتِ خاتمۂ دیوان

داد کا طالب غالب گزارش کرتا ہے کہ یہ دیوان اردو تیسری بار چھاپا گیا ہے۔ مخلص و داد آئین میر قمر الدین کی کارفرمائی اور خانصاحب الطاف نشان محمد حسین خاں کی دانائی مقتضی اس کی ہوئی کہ دس جزو کا رسالہ ساڑھے پانچ جزو میں منطبع ہوا اگرچہ یہ انطباع میری خواہش سے نہیں لیکن ہر کاپی میری نظر سے گزرتی رہی ہے اور اغلاط کی تصحیح ہوتی رہی ہے یقین ہے کہ کسی جگہ حرف غلط نہ رہا ہو مگر ہاں ایک لفظ میری منطق کے خلاف نہ ایک جگہ بلکہ سو جگہ چھاپا گیا ہے کہاں تک بدلتا۔ ناچار جا بجا یوں ہی چھوڑ دیا۔ یعنی کسو بکاف مکسور و سین مضموم و واؤ معروف میں یہ نہیں کہتا کہ یہ لفظ صحیح نہیں البتہ فصیح نہیں۔ قافیے کی رعایت سے اگر لکھا جائے تو عیب نہیں ورنہ فصیح بلکہ افصح کسی ہے واؤ کی جگہ یائے تحتانی۔ میرے دیوان میں ایک جگہ قافیہ کسو بواؤ ہے اور سب جگہ کسی بہ یائے تحتانی ہے اس کا اظہار ضروری تھا کوئی نہ کہے کہ یہ کیا آشفتہ بیانی ہے۔ اللہ بس ماسویٰ ہوس۔

یہ عبارت مرزا غالب نے ۱۲۷۸ھ میں اپنے دیوان کے تیسری بار منشی امو جان کے مطبع میں طبع ہونے کے وقت لکھی تھی ہم نے جو دیوان چھاپا ہے وہ اسی نسخے کے مطابق ہے۔

(حسرت)

ہماری شاہکار کتب

الاسماء الحسنیٰ	ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی	۱۲۰/=
کلیاتِ اعظم	اعظم چشتی	۲۵۰/=
کلیاتِ ظہوری	محمد علی ظہوری	زیرِ طبع
رزقِ ثناء (ایوارڈ یافتہ)	ریاض حسین چودھری	۱۳۰/=
محمد ﷺ محمد ﷺ	زاہد فخری	۱۰۰/=
جہانِ دانش	احسان دانش	۳۰۰/=
جہانِ دگر	احسان دانش	۳۵۰/=
زنجیرِ بہاراں	احسان دانش	۱۶۰/=
صندل	قتیل شفائی	۱۵۰/=
تنہا تنہا گزری ہے	مظفر وارثی	۱۵۰/=
گئے دنوں کا سراغ	مظفر وارثی	۱۵۰/=
دیوارِ چین کے اس پار	سید ارشاد احمد عارف	۱۲۰/=
معجزے حسن جمال کے	شوکت علی شاہ	۲۵۰/=
اجنبی اپنے دیس میں	شوکت علی شاہ	۱۵۰/=
سلگتے ساحل	شوکت علی شاہ	۲۵۰/=
خواب سہانے یاد آتے ہیں	حسن رضوی	۱۵۰/=
پیا رے	حسن رضوی	۱۳۰/=
سبز رتوں کی جھلمل میں	سعد اللہ شاہ	۴۰۰/=
مجھے بادل اٹھا لائے	سعد اللہ شاہ	۴۰۰/=
ابھی تک آنکھ ہے پُرنم	سعد اللہ شاہ	۴۰۰/=
بادل چاند ہوا اور میں	سعد اللہ شاہ	۱۵۰/=
تمہی ملتے تو اچھا تھا	سعد اللہ شاہ	۱۵۰/=
دھوپ کا چاند (نیا شعری مجموعہ)	سعد اللہ شاہ	۱۵۰/=
اشکوں سے بھری آنکھیں	محمد احمد صابر	۱۸۰/=
آتش پرست (ناول)	محمد اسلم راہی	۲۵۰/=
بابل و نینوا (ناول)	محمد اسلم راہی	۲۵۰/=

اک کمی سی رہ گئی	سعداللہ شاہ	۱۵۰/=
اک وعدہ نبھانا ہے	سعداللہ شاہ	۱۳۰/=
محبت	سعداللہ شاہ	۱۵۰/=
نیلے پھولوں کی بارش میں	سعداللہ شاہ	۱۵۰/=
ایک پتھر پہ پھول گرتے رہے	سعداللہ شاہ	150/=
جہاں پھولوں کو کھلنا تھا	سعداللہ شاہ	۱۵۰/=
کچھ دیر ٹھہر اے دل	سعداللہ شاہ	۱۵۰/=
محبت ہمسفر میری	باقی احمد پوری	۱۲۰/=
اب دل ہی نہیں لگتا	باقی احمد پوری	۱۲۰/=
صندل میں سانسیں جلتی ہیں	بشریٰ رحمن	200/=
چاند سے نہ کھیلو	بشریٰ رحمن	80/=
بت شکن	بشریٰ رحمن	130/=
شرمیلی	بشریٰ رحمن	120/=
بہشت	بشریٰ رحمن	120/=
کبھی جو خواب اترے تھے	شعیب علی سید	۱۲۰/=
ذرا جو تم ٹھہر جاتے	آصف شفیع	۱۰۰/=
ترے ہمراہ چلنا ہے	آصف شفیع	۱۰۰/=
روشن غزلیں	آصف شفیع	۳۰۰/=
چاند نے بادل اوڑھ لیا	فاخرہ بتول	۱۲۰/=
کہو وہ چاند کیسا تھا	فاخرہ بتول	۱۲۰/=
پلکیں بھیگی بھیگی سی	فاخرہ بتول	۱۲۰/=
اب بھرے شہر میں مجھے ڈھونڈو	فاخرہ بتول	۱۳۰/=
سمندر پوچھتا ہوگا	فاخرہ بتول	۱۴۰/=
دور مت نکل جانا	فاخرہ بتول	120/=
چاند اور میں	فائزہ ندیم فزا	۱۵۰/=
ترا عکس آئینوں میں	زاہد منیر عامر	۱۰۰/=
دل بہت اداس ہے	اختر ملک	۱۲۰/=

مقدمہ شعر و شاعری

الطاف حسین حالی

خزینہ علم و ادب
الکریم مارکیٹ اردو بازار - لاہور ۲۳۱۲۲۶۹